پاکستان کی ٹریڈ یونینز میں رہنما خواتین

جدوجہد اور قیادت کی کہانیاں



Friedrich Ebert Stiftung

پاکستان آفس

BNU

اشاعت

شائع کردہ:
فریڈرک ایبرٹ اسٹفٹنگ
۲۵، گلی ۲۹، سیکٹر F-8/1،
پی او بکس ۱۲۸۹، اسلام آباد، پاکستان

مدیران
فیلکس کولیسٹس، کنٹری ڈائریکٹر
سدرہ سعید، پروگرام ایڈوائزر

رابطہ
فون: +92 51 2803391-2
Info.pakistan@fes.de

ڈیزائن/ترتیب
ایگلو کمیونیکیشن

فریڈرک ایبرٹ اسٹفٹنگ کا اس اشاعت میں پیش خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ فریڈرک ایبرٹ اسٹفٹنگ کی جانب سے شائع کردہ تمام ابلاغی مواد کا تجارتی مقاصد کے لئے استعمال ایف۔ای۔ایس پاکستان کی تحریری رضامندی کے بغیر ممنوع ہے۔ ایف۔ای۔ایس کی مطبوعات کسی بھی الیکشن مہم کے لیے استعمال نہیں کی جاسکتیں۔

مترجم
الف سے ے

نومبر ۲۰۲۵
فریڈرک ایبرٹ اسٹفٹنگ (ایف ای ایس) پاکستان آفس
آئی۔ایس۔بی۔این: ۹۷۸-۹۶۹-۷۶۷۵-۸۲-۹

ایف ای ایس پاکستان کی دیگر مطبوعات اس ویب سائٹ پر دیکھی جاسکتی ہیں:
Pakistan.fes.de/publications

پاکستان کی ٹریڈ یونینز میں رہنما خواتین

جدوجہد اور قیادت کی کہانیاں

فہرست

پیش لفظ ۔۔۔

پیش لفظ

پاکستان کی خواتین مزدور تحریکوں کو ترتیب دینے، ان کی راہبری کرنے میں، اور عدم مساوات جیسے حالات سے مقابلہ کرنے میں بہت عرصے سے پیش پیش رہی ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کی جدوجہد اور کامیابیاں سماجی رکاوٹوں اور فرسودہ صنفی قوائد کی وجہ سے نمایاں نہیں ہو سکیں۔ "پاکستان کی ٹریڈ یونینز میں خواتین رہنما—جدوجہد اور قیادت کی کہانیاں" کا مقصد اس غیر متوازن رویوں کو درست کرنا ہے اور ان کی آوازوں اور تجربات کو سامنے لے کر آنا ہے۔

اس اشاعت نے گیارہ اہم کہانیوں کے ذریعے عورتوں کے سفر کے بارے میں جانا جنھوں نے ٹریڈ یونینز کے پیش منظر کو توقع کے برخلاف یکسر تبدیل کر دیا۔ سندھ کی لیڈی ہیلتھ ورکرز جو اپنے حق کے لیے کھڑی ہوئیں سے لے کر گھر سے کام کرنے والی عورتیں تک جو اپنی قانونی حیثیت کے لیے مسلسل لڑتی رہیں، یہ کہانیاں خواتین کی متفقہ کوششوں، پختہ یقینی اور قیادت کی عکاسی کرتی ہیں جو اپنے کام کی جگہ پر حقیقی مقام حاصل کرنے کے لیے پر عزم ہیں۔ ہر بیانیہ، اجتماعی عمل، وقار، اور برابری کی بنیادوں کو صبر آزماء طریقوں سے حاصل کرنے کی جدوجہد کا خود اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔

بیکن ہاؤس نیشنل یونیورسٹی کے ہنر مند طلباء نے تصویروں کے ذریعے ان کہانیوں میں زندگی بھر دی ہے، جس کی بدولت ان کہانیوں کو تعلیمی حلقوں اور مزدوروں کے حقوق کے علمبرداروں کے علاوہ اوروں سے بھی آشنا کروایا ہے۔ فنی اور عملی سرگرمیوں کے امتزاج سے یہ اشاعت وسیع تر سامعین کو مدعو کرتی ہے کہ وہ اس جدوجہد اور ٹریڈ یونینز کی خواتین کی کامیابیوں سے جڑیں تاکہ وہ بھی اس پیچیدہ تاریخی عمل میں شامل ہو کر انسانیت کے تقاضوں تک رسائی حاصل کر سکیں۔

انٹرویوز نومبر اور دسمبر ۲۰۲۴ میں کیے گئے تھے اور تفصیلی انٹرویوز کی بنیاد پر تیار کردہ رپورٹ جون ۲۰۲۵ میں مکمل ہوئی تھی۔ یہ رپورٹ اس اشاعت کے آخر میں دیے ہوئے QR کوڈ کی مدد سے آن لائن دیکھی جا سکتی ہے۔

فریڈرک ایبرٹ اسٹفٹنگ کا ادارہ جمہوریت، سماجی انصاف، اور مساوی حقوق کے لیے کام کرنے کے لیے پر عزم ہے۔

یہ مجموعہ ہماری ان مسلسل کاوشوں کی عکاسی کرتا ہے جو ہم پاکستان میں خواتین رہنماؤں کی قیادت کے لیے کر رہے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ بیانات ماضی اور حال کے رہنماؤں کو نا صرف حوصلہ اور عزت بخشیں گے بلکہ اس کے علاوہ نئی آنے والی نوجوان خواتین کو متحرک کریں گے کہ وہ منظم ہوں، اپنی آواز اُٹھائیں، اور یقین اور اعتماد سے آگے بڑھیں۔

فیلکس کولیئس
کنٹری ڈائریکٹر

سدرہ سعید
پروگرام ایڈوائیزر

اظہار تشکر

یہ اشاعت ''پاکستان کی ٹریڈ یونینز میں خواتین رہنما—قیادت اور جدوجہد کی کہانیاں''، اس مجموعہ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جس میں ان کہانیوں کو تحریری جامع پہنانے کے ساتھ ساتھ ان خواتین کی آوازوں کو اجاگر کیا گیا ہے، جنھوں نے پاکستان میں مزدوروں کی تحریک کو مشکلات کے باوجود جرات اور یقین سے چلایا ہے۔

فریڈرک-ایبرٹ-اسٹفٹنگ پاکستان ڈاکٹر صباء گل خٹک کی دل سے مشکور ہے جنھوں نے انٹرویوز کیے اور ان کو تحریری شکل دی اور ان کا ترجمہ کیا جو اس کتاب کو مرتب کرنے کی بنیاد ہیں۔ان کی لگن مستند آوازوں کو اجاگر کرنے اور ان اہم بیانات کو محفوظ کرنے میں بیش قیمتی ہے۔

ایف ای ایس پاکستان، بیکن ہاؤس نیشنل یونیورسٹی کے ویزیول کمیونیکیشن ڈیزائن ڈپارٹمینٹ کے تعاون کو دل سے تسلیم کرتا ہے جنھوں نے تصویر کشی کر کے اس اشاعت کو تیار کیا۔ڈپارٹمنٹ کے اساتذہ اور طلباء کے عزم اور تخلیقی صلاحیت نے پروفیسر راشد رانا، مریم داؤد سکول آف ویزول آرٹس اینڈ ڈیزائن کے ڈین کی رہنمائی میں ان کہانیوں کو ایک حیرت انگیز اور ذہن کو جھنجھوڑنے والی تصویروں کے نئے انداز سے پیش کیا۔

مریم داؤد سکول آف ویزیول آرٹس اینڈ ڈیزائن، بی این یو کی ٹیم، بشمول دعا خان کنڈی (لیکچرار)، امیمہ محسن (اسسٹنٹ پروفیسر) اور قانیتہ ملک (آؤٹ ریچ اینڈ کمیونیکیشن مینیجر) نے تصویر کشی کے عمل کو منظم کرنے اور رہنمائی کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ان کی اعانت، سرپرستی اور تعاون نے اس اشاعت کے اعلی معیار کو فنی ہم آہنگی میں اضافہ کیا گیا ہے۔

مریم داؤد سکول آف ویزیول آرٹس اینڈ ڈیزائن کے ویزیول کمیونیکیشن ڈیزائن ڈپارٹمنٹ کے ہونہار طلباء کا ہم تہہ دل سے شکر گزار ہیں جنھوں نے ان کہانیوں کو اپنی بھرپور تخلیقی فنی صلاحیتوں سے زندگی بخشی۔ان کی غور و فکر سے آراستہ تشریحات اور تخلیقی عزم نے ان خواتین جو اس اشاعت میں موجود ہیں، ان کے جزبے اور ثابت قدمی کی بہت خوبصورتی سے عکاسی کی ہے۔

آئمہ محمود

آئمہ محمود لاہور کے مزدوروں کی تحریکوں سے تعلق رکھنے والے ایک متحرک خاندان میں پیدا ہوئیں جہاں انھوں نے اپنے والد چودھری گلزار احمد کے حق میں یکجہتی کے نعرے سنے جو ۱۹۷۰ میں ٹریڈ یونین کے مشہور رہنما تھے۔ آئمہ کو مزدوروں کی تحریکوں کے لیے آواز بلند کرنا نہ صرف وراثت میں ملا تھا بلکہ یہ جذبہ ان کی زندگی کا مقصد بھی بن چکا تھا۔

آئمہ نے پولیٹیکل سائنس کی تعلیم حاصل کی۔ جب ان کے والد کی ضیاء کے دور میں یونین ایکٹیوزم کی وجہ سے نوکری ختم ہو گئی تو اپنے خاندان کی خاطر انہوں نے نوکری شروع کر دی۔ مزدوروں کے اور خاص طور پر اپنے والد کی جدوجہد کے مشاہدے سے ان کا یقین محنت کی عظمت اور اجتماعی عمل میں مستحکم ہو گیا۔

سالہا سال کی جدوجہد کے بعد وہ پنجاب کی ٹریڈ یونینسٹ خاتون رہنما کی حیثیت سے ابھر چکی ہیں۔ آل پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن پنجاب کی جنرل سیکٹری کی حیثیت سے انھوں نے یونین کے اندر بری طرح سے موجود پدر شاہانہ رویوں کا سامنا کیا۔ خواتین کے مسائل جیسے کہ غیر مساوی تنخواہیں، بچوں کی نگہداشت کا فقدان، غیر محفوظ ٹرانسپورٹ، اور تحفظ کا خوف جو اکثر نظر انداز کر دیے جاتے تھے لیکن آئمہ مسلسل ان کو باور کرانے میں کوشاں رہیں۔

انھوں نے صنعتی مزدور اتحاد کی بنیاد رکھی، جو نوجوان مزدور اور خواتین کے لیے ایک پلیٹ فارم تھا جو بڑی عمر کے مرد رہنما کی بالادستی کے لیے ایک چیلنج تھا اور مزید یہ کہ انھوں نے یونین کے کام میں ٹیکنالوجی کو بھی متعارف کروایا۔ انھوں نے پنجاب سوشل سیکیوریٹی اتھارٹی میں بھی اپنی خدمات انجام دیں جس میں انھوں نے کامیابی سے خواتین کی اصلاحات کی وکالت کرتے ہوئے ان کو سوشل سیکیورٹی کارڈز کا بنیادی جانشین ٹھہرآیا تاکہ ان کے بچوں اور شوہروں کو بھی تحفظ مل سکے۔

آئمہ پاکستان کی مزدوروں کی تحریک کی پابندیوں کے بارے میں دلیرانہ انداز میں اظہار کرتی ہیں۔ وہ اس کے اندر توڑ پھوڑ، نوجوان قیادت کے فقدان اور خواتین کی آواز کو نظر انداز کرنے جیسے مسائل پر بھرپور نقطہ چینی کرتی ہیں اور ان کو تبدیل کرنے کے لیے پر عزم ہیں۔

''خواتین کو صرف یونینز میں موجود نہیں ہونا چاہیے۔ انھیں اپنی بات رکھنی چاہیے اور ان کو سنا بھی جانا چاہیے۔ زیادہ تعداد میں خواتین کا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اگر صرف خاموشی ہی ردِ عمل ہو۔''

آئمہ کے لیے کامیابیاں چھوٹے چھوٹے اقدام سے ملتی ہیں مگر ان کا اثر واضح ہوتا ہے: گھر سے کام کرنے والے اور گھریلو ملازمین کو قانونا تسلیم کرنا، خواتین کا اینٹی لیبر کوڈ اتحاد میں شمولیت اور افسران کا خواتین کے ساتھ میز پر بیٹھ کر گفتوشنید کرنے کو یقینی بنانا۔ انھوں نے ٹریڈ یونین کی تحریک میں خواتین کا مردوں کے ہم پلہ ہونے کا خواب دیکھا ہے جو صرف ظاہری نا ہو بلکہ حقیقت پر مبنی ہو۔

مفسر: بلال احمد

راہِ کُشا

آئمہ محمود

پاکستان میں ٹریڈ یونین کی جدوجہد کا سفر





میں ٹریڈ یونین سے بھرپور جدوجہد کے ماحول میں پلی بڑھی۔
میرے والد میرے مثالی کردار ہیں۔

جب میرے والد کی ملازمت ختم ہو گئی تو ہم سب کو ذمہ داری سنبھالنی پڑی۔
وہ ایک مشکل وقت تھا۔





سوشلسٹ نظریات نے مزدوروں کے حقوق اور محنت کی عظمت
سے متعلق میرے خیالات کو تشکیل کیا۔



خواتین کی آوازوں کو نظرانداز کیا گیا، اور ان کی جدوجہد کو پیچھے دھکیلا گیا۔



ہم نے خواتین، نوجوانوں اور مزدوروں کے لیے ایک نیا اتحاد بنایا۔

ہماری جدوجہد حقیقی تبدیلیاں لائی ہے جن میں خواتین سے متعلق قوانین اور غیر رسمی معیشت سے جڑے مزدوروں کی قانونی حیثیت شامل ہے۔





خواتین کی صرف موجودگی کافی نہیں، انھیں قیادت بھی کرنی چاہیے۔



ہماری لڑائی صرف سرمایہ داری کے خلاف نہیں—یہ وقار،
برابری، اور اس مستقبل کے لیے ہے جہاں خواتین بلاخوف
وخطر قیادت کر سکیں۔

فاطمہ مجید

فاطمہ مجید کراچی کے ایک ماہی گیری کے تاریخی گاؤں ابراہیم حیدری میں پیدا ہوئیں وہ ایسے لوگوں کے درمیان پلی بڑھیں جو سمندر سے مچھلی پکڑنے، جال بنانے اور کشتیاں تیار کرنے کا کام کرتے تھے۔ اپنے والد سے متاثر ہو کر جو انڈیا میں ایک دفعہ سرکریک کو عبور کرتے ہوئے قید ہونے کے بعد ماہی گیروں کی تنظیم کی ایک متحرک آواز بن گئے تھے۔ فاطمہ بچپن میں ہی ان برادری کی تحریکوں، ساحلی جنگلات، اور ماہی گیری کے فن سے ان کی وجہ سے واقف ہو گئی تھیں جب محمد علی شاہ ان موضوعات پر تربیت دے رہے تھے۔ انہوں نے ماہی گیروں کی جدوجہد کو بہت قریب سے دیکھا، جیسا کہ حد سے زیادہ مچھلیاں پکڑنا، سمندری آلودگی، اور انڈس ڈیلٹا کو بڑھتے ہوئے خطرات۔

فاطمہ کی تحریک پاکستان فشر فوک فورم سے شروع ہوئی جس میں وہ خواتین کے یونٹ سے ترقی پا کر سینئیر وائس چیر پرسن تک پہنچیں۔ انھوں نے طاہرہ علی شاہ اور دیگر سینئیر کارکنان کے ساتھ قریب رہ کر کام کیا، اجلاس منظم کیے، مہمات چلائیں اور ماحولیاتی مسائل جیسے علمی حلقوں کے ساتھ ساحلی جنگلات کے تحفظ پر کام کیا۔ ۲۰۱۳ میں انھوں نے اپنی سربراہی میں ۱۴ دنوں تک لانگ مارچ کی، ساحلی جنگلات کے لیے نعرے بازی کی، تقریریں کیں اور پورے سندھ کی خواتین کو متحرک کیا۔ سٹیج کے خوف اور اپنی ہی برادری کی مزاحمت کا سامنا کرتے ہوئے اپنے تجربات کی بناء پر وہ ایک پر اعتماد ماحولیاتی کارکن بن کر ابھریں۔

ان کی قیادت خواتین کی خود مختاری اور ماحولیاتی بالادستی پر مرکوز رہی۔ انھوں نے ماہی گیروں کی تحریکوں میں خواتین کی شمولیت کی بنیاد رکھی، نوجوانوں کے گروہ اور تھیٹر بنائے، اور نوجوان خواتین کو قیادت کرنے کے گر سکھائے۔ انہوں نے ماہی گیر سیاحت کی بنیاد ڈالی جو کہ مقامی کھانوں، ماہی گیروں کی ثقافت کی نمائش اور ساحلی جنگلات کی تباہی، آلودگی اور انڈس ڈیلٹا کی آلودگی کی اہمیت کی آگہی کو عام کرنے کی کاوش ہے۔

فشر فوک فورم کے علاوہ فاطمہ عورت مارچ (کراچی)، ہیومن رائیٹس کمیشن آف پاکستان، اور، ملیر ڈسٹرکٹ میں مقامی سیاست کی متحرک ممبر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے قومی اور بینالاقوامی سطح پر ماہی گیروں کی اور ماحولیاتی خدشات کی نمائندگی کی ہے جس میں (UNDP) یو این ڈی پی کی بنکاک میں تربیت اور (WWF) ڈبلیو ڈبلیو ایف کی مشاورت شامل ہیں۔ ان کا کام جرمن میڈیا اور جامعات جیسے حبیب یونیورسٹی اور قائداعظم یونیورسٹی میں متعارف کرایا گیا ہے۔

فاطمہ نے اپنی ذاتی مشکلات پر قابو پایا بشمول پڑھائی میں چار سال کی تاخیر جس کی وجہ خاندانی قدامت پسندی اور معاشرے میں خواتین کا رہنما بننے میں مشکوک رویہ تھا۔ پھر بھی انھوں نے تمام رکاوٹوں سے بہت سیکھا جو کہ ان کے قیمتی تجربات کا حصہ ہیں۔ انھوں نے ماہی گیروں اور ماحولیاتی حقوق کی بے خوف آواز بن کر اپنے آپ کو منوایا ہے۔

مستقبل کا تخیل: فاطمہ پاکستان میں ماہی گیروں کی ایک قومی تحریک بنانے کا خواب دیکھتی ہیں، جس میں خواتین برابر کی رہنما ہوں اور ماحولیاتی تحفظ کو سماج کی بقاء میں مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ وہ ساحلی جنگلات، دریاؤں، اور سمندر جن کو وہ 'ہمارے محافظ اور رکھوالے' سمجھتی ہیں، ان کو فوری طور پر محفوظ کرنے پر زور دیتی ہیں اور اصرار کرتی ہیں کہ ماہی گیروں کے لیے حقیقی برابری اور وقار صرف اجتماعی جدوجہد اور مضبوط خواتین کی تحریک سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

مفسر: شزا عمر

فاطمہ مجید

ڈیلٹا کی نگہبان

ایک ماہی گیر اور ماحولیاتی کارکن کی ساحلی جنگلات اور برابری کے لیے مارچ



میرے والدین ماہی گیر ہیں۔ میرے والد ان ماہی گیروں میں سے ایک ہیں جو ۸ ماہ کے لیے انڈیا کی جیلوں میں قید کاٹتے رہے۔ جب وہ واپس آئے تو انھوں نے ایک سماجی رفاحی ادارہ جو بچوں کی تعلیم پر توجہ دیتا تھا میں کام شروع کر دیا۔

میں ملیر کراچی کے
ایک مچھیروں کے گاؤں
ابراہیم حیدری میں پیدا ہوئی۔

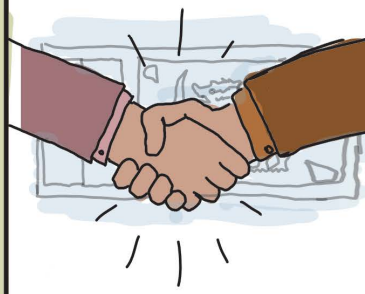

ان کی ماہی گیری سے متعلق
خدمات کو سراہتے ہوئے میرے
والد کو سری لنکا میں ایشین
کلچرل ڈیولپمنٹ فورم کے لیے
منتخب کیا گیا۔

میرے والد بہت سی ماہی گیروں کی تنظیموں سے ملے جو انڈیا اور سری لنکا کی تھیں۔ وہ مجھے اجلاسوں میں لے جاتے رہے اور میں نے اپنے والد کو اس سب میں بڑے پر جوش انداز سے حصہ لیتے دیکھا جس سے مجھے بھی حوصلہ ملا اور دلچسپی پیدا ہوئی۔

(نوجوان فاطمہ)

میں بہت گھبراجاتی تھی جب
مجھے تقریر کرنا ہوتی تھی لیکن
میرے سرپرست اس ڈر پر قابو
پانے کا حوصلہ دیتے تھے۔



میں ابراہیم حیدری میں
پاکستان فشر فوک فورم میں
خواتین یونٹ کی ممبر بن گئی۔

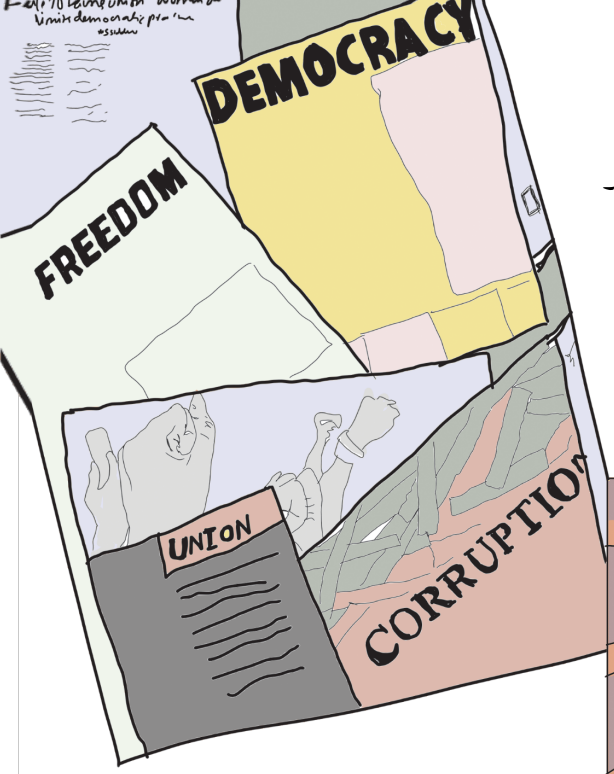



کبھی کبھار لوگ میری کردار کشی کرتے تھے لیکن میں نے
ان منفی باتوں کو اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیا۔







مجھے محسوس ہوا کہ پی ایف ایف کی قیادت کی اندرونی کشمکش کی
وجہ سے میرے لیے مخالفت پیدا ہوئی لیکن میں ساحلی جنگلات
اور دریاؤں کی حفاظت کے عزم پر قائم رہی۔

۲۰۱۳ میں ہم نے جامشورو سے ساحلی جنگلات کا ماحول پر منفی اثرات کی آگہی پیدا کرنے کے لیے
۱۴ دن کی لانگ مارچ منظم کی۔ میں اپنی آواز بلند کرتی تھی اور احتجاج میں پرزور تقریریں کرتی تھی۔





میں نے مقامی حکومت کے الیکشن میں انتخابی نشست حاصل کرنے کے لیے بہت مضبوط امیدوار کے خلاف بھی مقابلہ کیا لیکن میں ہار گئی تھی۔
پھر پی پی پی نے مجھے خواتین کی مخصوص نشست پر جگہ دی۔ اب میں ڈسٹرکٹ ملیر کی صدر ہوں۔



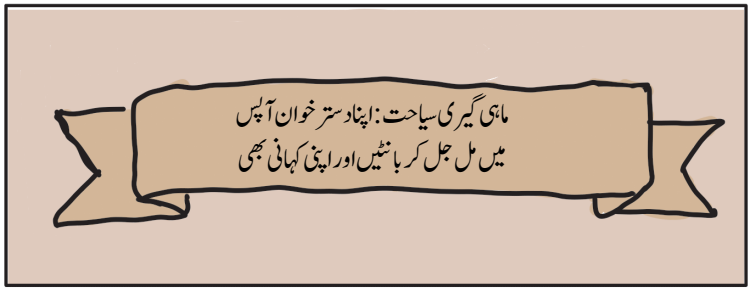



اب میں ہفتے میں دو سے تین ماہی گیری کے تفریحی دورے منظم کراتی ہوں۔ ہم مقامی کھانوں کو فروغ دیتے ہیں اور ساحلی جنگلات اور انڈس ڈیلٹا کی تباہی سے متعلق آگہی پیدا کرتے ہیں۔



(قیدی ماہی گیر کو رہائی دلوائی)

میں نے تمام مصیبتیں جو جھیلیں ہیں ان سے سیکھا ہے نا کہ ان کو رکاوٹیں سمجھا ہے۔ جس کی وجہ سے میں آج ماہی گیروں کے فورم کی سینئر نائب صدر ہوں۔

(تعلیمی بیٹھک منعقد کی)





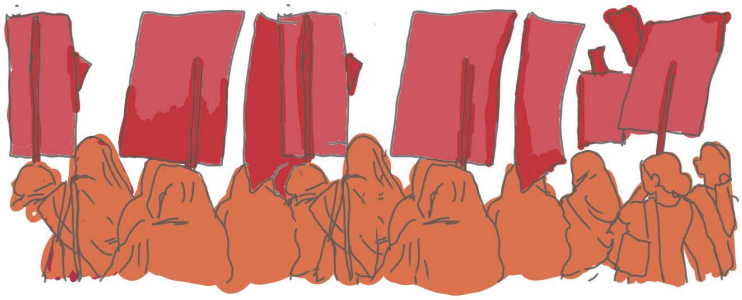

آج میری اپنی پہچان ہے۔ UNDP نے مجھے بنکاک بھیجا۔
جرمن اخباروں نے میرے کام کے بارے میں لکھا۔
مجھے بہت سی جگہوں پر بولنے کے لیے مدعو کیا گیا۔



ہماری جدوجہد جاری وساری ہے۔ ہمیں پاکستان کے ہر ضلع میں ماہی گیروں کے لیے ایک قومی آواز چاہیے۔
اور ایک خاتون کی حیثیت سے میں سمجھتی ہوں کہ آپ کو مضبوط اور باہمت ہونا چاہیے۔ میرے کام کی پہچان ہی میری کامیابی ہے۔

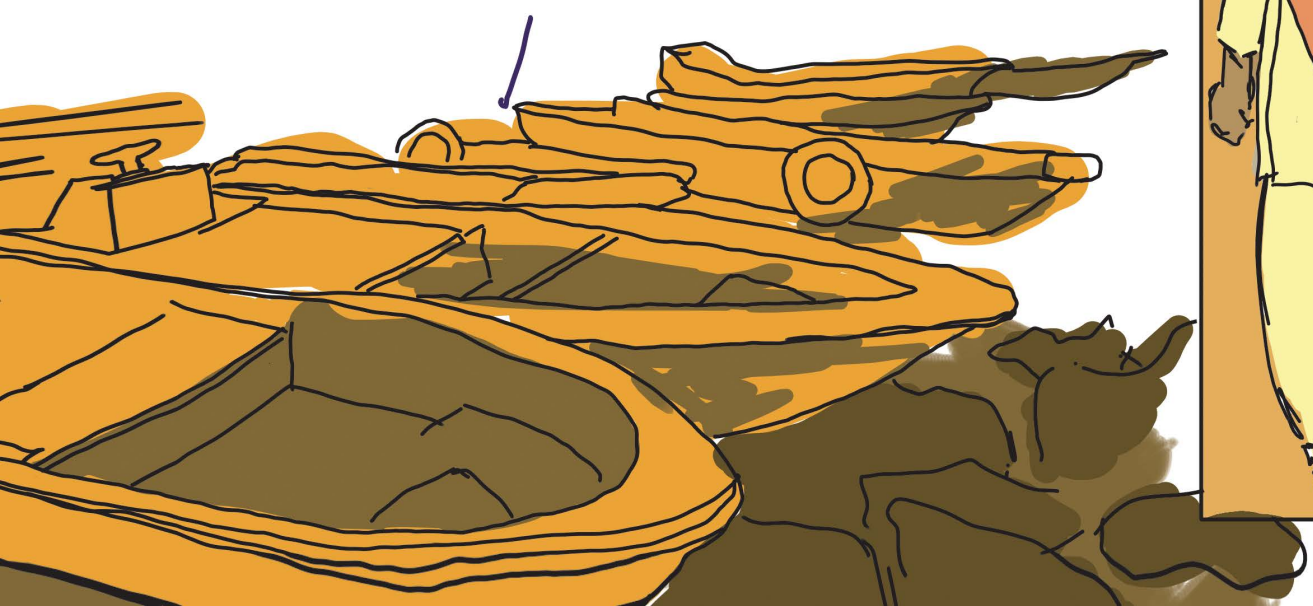

حلیمہ ذوالقرنین لغاری

سندھ کے ضلع ٹنڈو الہ یار چھمبر شہر میں پیدا ہونے والی حلیمہ ذوالقرنین ایسے معاشرے میں پلی بڑھیں جہاں لڑکیوں کی تعلیم ناپید تھی، خاص طور پر انکے بلوچ قبیلے میں۔ ان کی والدہ جنھیں افسوس تھا کہ انھیں سکول چھٹی جماعت سے چھوڑنا پڑا مگر ان کا پختہ ارادہ تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو ضرور پڑھائیں گیں۔ ان کی حوصلہ افزائی سے حلیمہ نے باوجود خاندان کی مخالفت کے سوشیالوجی میں ماسٹرز کیا۔

حلیمہ کی شادی کم عمری ہی میں ہوگئی مگر ان کا پہلا خاوند ان کا معاشی استحصال کرتا تھا اور بدسلوکی بھی کرتا تھا۔ انھوں نے اپنی ماں کی پشت پناہی میں اس سے طلاق لے لی جو کہ ان کی برادری میں ایک جرائتمندانہ قدم تھا۔ ان کی شادی کی تقریب کے موقع پر ان کے بھائیوں کے کہنے پر پولیس نے ہراساں کیا جو کہ ان کی ماں کو دل کا دورہ پڑھنے اور بعدازاں ان کی موت کا سبب بنا مگر ماں کو کھو دینے اور خاندان کے مسترد کیے جانے کے باوجود بھی ان کا جذبہ متزلزل نا ہوا۔

ان کا عملی زندگی کی دنیا میں داخل ہونے کا سلسلہ لیڈی ہیلتھ ورکرز (LHWs) پروگرام جس کی ابتدا ۱۹۹۵ میں ہوئی تھی سے شروع ہوا۔ اپنی تربیت کے دوران نمایاں کارکردگی کی وجہ سے وہ ۱۹۹۸ میں سپروائیزر بن گئیں لیکن وہ اور ان کی ساتھیوں کو بہت ناانصافی کا سامنا کرنا پڑا جیسا کہ کم تنخواہیں، کام کی بے ضابتگیاں، اور تاخیر سے معاوضہ۔ اشتعال میں آکر حلیمہ نے احتجاج منظم کیے جس کی بدولت LHWs کو بہتر تنخواہیں ملیں اور ضابطہ سازی ہوئی۔ یہ جدوجہد شدید مزاحمت سے بھرپور تھی: خواتین کو زدوکوب کیا گیا، جیلوں میں ڈالا گیا، اور احتجاج کرنے پر طلاقیں ہوئیں۔ حلیمہ کو بھی معطل کیا گیا اور وہ مظاہروں کے دوران زخمی ہوئیں، لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔

کئی سالوں میں انہوں نے ہزاروں LHWs کو منظم کیا اور آل سندھ لیڈی ہیلتھ ورکرز ایسوسیشن کی بنیاد رکھی اور بعد میں اتحادی اداروں کے تعاون سے مل کر اسے ٹریڈ یونین کی شکل دے دی۔ آج وہ فیڈریشن کی سربراہی کر رہی ہیں جس کے سندھ میں ۱۷۰۰۰ ممبرز ہیں اور وہ لیڈی ہیلتھ ورکرز فیڈریشن آف پاکستان کی صدر بھی منتخب ہوگئیں۔

ان کی قیادت ہمدردی اور پختہ عزم پر قائم ہے۔ وہ خواتین کی روزمرہ کی مشکلات کو سنتی ہیں جیسے تنخواہیں، سکولوں کی فیسیں، اور ہراسانی سے جڑے مسائل، اکثر اپنی جیب سے مزدوروں کی مدد کرتی ہیں اور سب سے اہم یہ کہ ان میں اپنے حقوق کے حصول کے لیے بیداری پیدا کرتی ہیں۔ باوجود سیاسی مداخلت، پولیس تشدد، اور حکام کی جانب سے پیدا کردہ تفریق کے انھوں نے تحریک کو زندہ رکھا۔

"ایک وقت تھا جب کہا جاتا تھا کہ LHWs کو قانونی درجہ دینا ایسا ہی ناممکن ہے جیسا کہ کسی خواجہ سرا کے ہاں اولاد کا پیدا ہونا۔ آج ہم تمام حقوق کے ساتھ مستقل ملازمین ہیں۔ کچھ بھی ناممکن نہیں اگر عورتیں ہمت کے ساتھ آگے بڑھیں۔"

حلیمہ اب قومی اور بین الاقوامی سطح پر پولیو کی مہمات کے دوران تحفظ، مناسب اجرتیں، اور سماجی تحفظ جیسے مسائل کی وکالت کرتی ہیں۔ ان کے لیے قیادت کا مطلب اصول پرستی ہے: "سب سے پہلے اپنا کام ایمانداری سے کریں، پھر اپنے حقوق کی بات کریں۔" ان کا سفر بتاتا ہے کہ عورت سخت ترین حالات میں بھی ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔

مفسر: عبداللہ شاہد



حلیمہ ذوالقرنین لغاری

لیڈی ہیلتھ ورکرز کے لیے
ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے گامزن

میرے لغاری قبیلے میں لڑکیوں کی تعلیم ناپید تھی۔
لیکن میری والدہ ہماری تعلیم کے لیے لڑیں۔

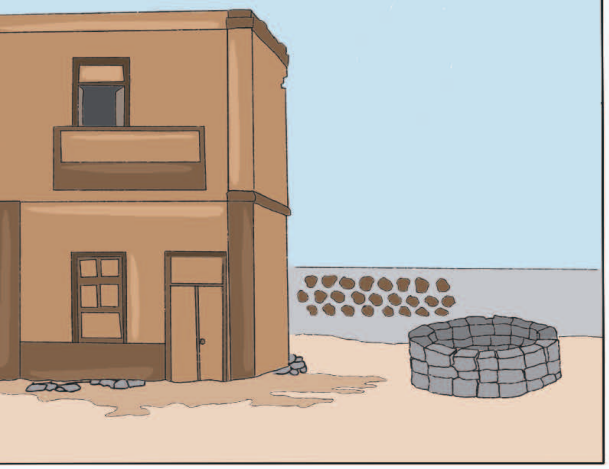

میں لاڈلی نہیں تھی کیونکہ میں منجھلی تھی بہن بھائیوں میں۔
میرے والد نے تین شادیاں کی تھیں۔

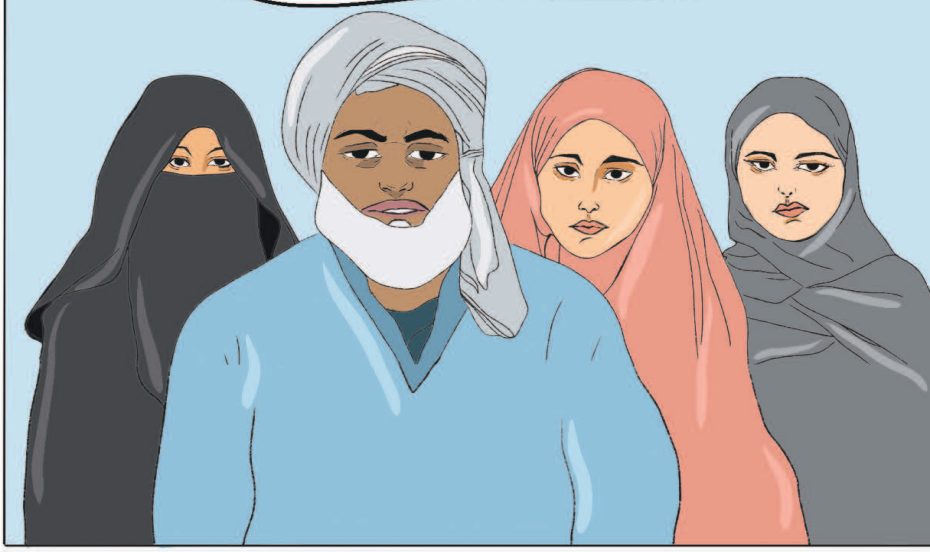

ایک امیر آدمی کی منجھلی اولاد ہونے کی وجہ سے
میں اکثر سوچتی تھی کہ اگر میری ضرورت ہی نہیں تھی
تو میں پیدا ہی کیوں ہوئی؟



میری زندگی پر میری ماں نے بہت گہرا اثر ڈالا۔
وہ نہ صرف میری تعلیم کے لیے کھڑی ہوئیں بلکہ انہوں نے اصرار کیا
کہ میں کام کروں باوجود اس کے کہ میں ایک
امیر آدمی کی بیٹی ہوں۔



میں ۱۹۹۵ میں سرکاری لیڈی ہیلتھ ورکرز پروگرام کی
رکن بنی، میری ماں کہا کرتی تھیں کہ تم ایک
چھوٹی ڈاکٹر بن سکتی ہو



۱۹۹۸ میں میری شادی اپنے کزن سے ہوگئی۔۔۔
اس نے میری شادی پر دی گئی سلامی بھی لے لی
اور میری تنخواہ بھی۔



ہماری اکثر لڑائی ہوتی تھی اور آخر کار میری ماں
نے کہا کہ اس سے پہلے کہ یہ تمہاری زمین کا حصہ
بھی ہتھیا لے تم اس سے طلاق لے لو۔
میں نے ۲۰۱۱ میں اس سے طلاق لے لی۔



۲۰۱۵ میں میں نے اپنے قبیلے سے باہر شادی کر لی جس
پر میرے بھائی نے پولیس بھجوا دی۔



ہمیں اتوار کی چھٹی بھی نہیں ہوتی تھی؛ زچگی کی چھٹی
صرف ۲۰ دن کی ملتی تھی۔ ۱۰
دن ولادت سے پہلے اور ۱۰ دن ولادت کے بعد۔
ہم ۳۰۰۰ روپے ماہانہ کماتے تھے؛ تنخواہیں کئی ماہ تاخیر سے ملتی تھیں
یہاں تک کہ عید پر بھی تاخیر ہو جاتی تھی۔

میری ماں کو اتنا صدمہ ہوا کہ ان کو دل کا دورہ پڑا
اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

ہم نے بد دیانتی کے طور طریقوں کے خلاف احتجاج کیا۔
سیاست ہمارے اندرونی معاملات میں گھس گئی تھی۔
مجھے ایک ادھ مری تنظیم کو جگانا پڑا۔

ہمیں انصاف چاہیے

ہم نے ۲۰۱۲ تک بڑے جوش سے احتجاج کیے۔۔۔۔
جب پولیس تشدد پر اتر آئی اور انہوں نے آبی توپوں کا استعمال کیا
تو گورنر سندھ نے اس بات کا نوٹس لیا۔

۱۲ فروری ۲۰۱۲ کو تقریباً ۵۵ خواتین کو سکھر جیل میں ڈالا گیا؛ اسی طرح LHWs
کو کراچی اور بلوچستان میں قید کر دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ۵ لڑکیوں کو طلاق ہو گئی۔

انہوں نے کہا کہ ۳۰۰۰۰ لیڈی ہیلتھ ورکرز کو قانونی حیثیت
دینا ناممکن ہے۔ اب ہماری ۵ صوبائی یونینز ہیں اور
ایک قومی فیڈریشن ہے اور میں اس کی صدر ہوں۔

۲۰۱۷ میں ۷۰۰۰ امزدوروں کی صدر ہونے
کے ناطے میں نے اپنی ہی تنخواہ کو خرچ کیا۔۔۔
معطلی کا سامنا کیا، چوٹیں کھائیں اور سیاسی دباؤ برداشت کیا۔

آج ہم ۵۳۰۰۰ روپے ماہانہ تنخواہ لیتے ہیں
بشمول الاؤنسز۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

ایک دفعہ میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا، اگر میری
ضرورت نہیں تھی
تو میں پیدا ہی کیوں ہوئی؟ اب مجھے سمجھ آئی۔۔۔
یہ سفر ہی میرا مقصد ہے۔

آخرکار گورنمنٹ کی اٹھارویں ترمیم ۲۰۱۰ کے ضابطے سے ہمیں
قانونی حیثیت حاصل ہو گئی۔ صحت کا ادارہ صوبے کو یکم جولائی ۲۰۱۱ کو منتقل ہو گیا
جس سے لیڈی ہیلتھ ورکرز انفرادی طور پر صوبائی حکومتوں
کے دائرہ اختیار میں آ گئیں۔ ہم نے آل سندھ لیڈی ہیلتھ ورکرز ایسوسی ایشن بنائی۔

میرے شوہر میری وہیل چیئر چلاتے ہوئے مجھے
ہر اجلاس میں لے جاتے تھے۔
ہم تنخواہوں، تحفظ، اور وقار کے لیے لڑتے ہیں۔

ہماری مدد/راہنمائی ٹریڈ یونین بنانے میں ورکرز ایجوکیشن اینڈ
ریسرچ آرگنائزیشن (WERO) اور پبلک سروس انٹرنیشنل (PSI) نے کی۔

کنیز فاطمہ

کنیز فاطمہ کا نام پاکستان کی مزدوروں کی تحریک کی تاریخ میں نقش ہے۔ وہ پاکستان میں پہلی ٹریڈ یونین کی رہنما تھیں۔ ۱۹۶۰ میں اپنے سفر کا آغاز کرتے ہوئے وہ پہلی خاتون بنیں جنھوں نے انتظامیہ اور حکومت دونوں کو یونین کی مہم جوئی سے للکارا۔ ایک بچی کی حیثیت سے ان کے والدین اور بھائی کی آزادی کی تحریک میں جدوجہد نے انھیں متاثر کیا۔ جب ان کے والد کو پابند سلاسل کیا گیا تو ان کی ماں نے آواز اُٹھائی۔ اس طرح کنیز کو کم عمری ہی سے معلوم تھا کہ ان کی زندگی کا کوئی مقصد ہے۔ وہ مولانا بھاشانی سے متاثر ہو کر ترقی پسند سیاست میں شامل ہو گئی تھیں اور بندر گاہوں کے دستی مزدوروں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کے دوران وہ کراچی میں عورتوں کو منظم کرنے میں شامل رہیں۔ وہ کراچی شپ یارڈ ورکرز یونین کی صدر تھیں۔

ایسے وقت میں جب خواتین شاذونادر یونین میں شمولیت اختیار کرتی تھیں کنیز نے عام سماجی دستور سے انحراف کرتے ہوئے دلیرانہ خطرات مول لیے۔ کنیز فاطمہ کی سب سے پہلی عوامی وابستگی کراچی میں ۱۹۶۳ میں مزدوروں کے احتجاج میں ہوئی جو سیکیورٹی پرنٹنگ پریس سے شروع ہوئی اور کئی ماہ تک چلی۔ پرانی قیادت نے جب اپنی ساکھ کھو دی تو نئے رہنما ابھرے۔ کنیز فاطمہ نے یکجہتی ظاہر کرتے ہوئے خواتین اور بچوں کو منظم کیا اور ریگل چوک کے پاس سڑک پر بٹھا کر روایتی جھولی فنڈ کے طریقے سے چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا جس سے عوامی حمایت حاصل ہوئی۔ خواتین کے احتجاج کے تیسرے دن مزدوروں کے مطالبات تسلیم کر لیے گئے۔ ۱۹۶۶ میں انھوں نے ایک بہت بڑی ریلی مختلف کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے حقوق کے لیے نکالی۔ نتیجتاً انھیں کراچی سے نکال کر ٹھٹہ بھیج دیا گیا جہاں پر انھوں نے جیل سے ہی مزدوروں کو منظم کیا۔

انھوں نے کراچی میں مزدوروں کی رہائش گاہوں سے تعلیمی حلقوں کو منظم کیا جہاں انھوں نے مزدوروں اور ان کے خاندان کو جمع کر کے ٹریڈ یونین کے بارے میں سمجھایا کہ وہ کس طرح بنتی ہیں ان کی کیا اہمیت اور فوائد ہیں۔ انھوں نے مرد مزدوروں کو حوصلہ دیا کہ وہ اپنی ساتھی عورتوں کو یونین میں سرگرمی سے حصہ لینے دیں۔ اپنی تمام متحرک زندگی میں کنیز فاطمہ بہتر کام کے ماحول، تنخواہوں اور مزدوری کرنے والی خواتین کو تسلیم کروانے کے لیے مہمات چلاتی رہیں۔ وہ ان لوگوں کے لیے آواز اُٹھاتی رہیں جن کا کام منظر عام پر نہیں ہوتا تھا مثال کے طور پر بھٹے پر کام کرنے والی عورتیں، حاری خواتین، اور جبری مشقت والے مزدور، کاٹھیاواری عورتیں جو سڑکیں بنانے میں شامل ہوتی ہیں، کوڑا صاف کرنے والیاں اور کھیتوں میں مشقت کرنے والیاں اور انھیں سمجھاتی رہیں کہ وہ اپنے حق کے لیے یونین بنائیں۔ ایوب خان اور یحییٰ خان کے دور میں بار بار گرفتار ہونے کے باوجود وہ قید میں ہوتے ہوئے بھی مزدوروں کو منظم کرتی رہیں۔

کنیز علامتی برائے نام نمائندگی پر شدید نقطہ چینی کرتی تھیں۔ ان کا ماننا تھا کہ لوگوں کی سوچ کو یکسر بدلنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے ٹریڈ یونینز میں خواتین ونگ کے خیال کی ہمیشہ مخالفت کی کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ مردوں اور عورتوں کو اکٹھے ہو کر برابری پر ایک پلیٹ فارم سے کام کرنا چاہیے تاکہ مزدوروں کے مجموعی اور مخفی فوائد حاصل ہو سکیں۔ انھوں نے نہ صرف ٹریڈ یونینز بلکہ سماج میں بھی تمام تر رکاوٹوں کو توڑا۔ ان کی قیادت میں خواتین نے یونینز کی سرگرمیوں میں اپنی جگہ بنانی شروع کر دی جس کا اس سے پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بیشتر خواتین جو آج یونینز میں سرگرم ہیں ان کی ہمت سے بنائی ہوئی بنیادوں پر کھڑی ہیں۔

ان کی زندگی اس نظریہ کا عہد نامہ ہے کہ خواتین مزدوروں کی تحریک کی پیروی کرنے والی نہیں بلکہ وہ بھی رہنما ہو سکتی ہیں جو مالکان اور پدر شاہی نظام کے خلاف کھڑی ہو سکتی ہیں۔

"کامیابی صرف بہتر اجرت یا مضبوط نمائندگی ہی سے نہیں بلکہ یہ مزدوروں کو اپنے حقوق سمجھنے اور ان کو جرات مندی سے حاصل کرنے میں ہے۔"

مفسر: راحیل حسین

کنیز فاطمہ



پاکستانی ٹریڈ یونین کی
پہلی رہنما خاتون


میں سماج اور استحصال جیسے الفاظ سن کے بڑی ہوئی ہوں کیونکہ میرے والد آزادی کی تحریک میں سیاسی طور پر سرگرم تھے، وہ کانگریس پارٹی میں تھے جس کی وجہ سے وہ کبھی کبھی لمبے عرصے کے لیے قید میں رہتے تھے جبکہ میری والدہ تحریک خلافت کے لیے کام کرتی تھیں۔
بچپن سے ہی یہ بات مجھے ذہن نشین تھی کہ ہمارے ملک کو برطانوی سامراج سے آزاد ہونا چاہیے جو تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ مجھے یہ بات اچھی طرح واضح تھی کہ ہمیں تاجروں سے آزادی چاہیے۔
میں اپنے والد کہ جیل میں ملنے جاتی تھی تو معصومیت سے یہ کہتی تھی کہ میں نے بھی یہاں آنا اور رہنا ہے۔
اور اس طرح میں مزدوروں کے حقوق کے لیے میدان میں اتری۔

میرا خاندان گجرانوالہ سے کراچی منتقل ہوا جب میں فرسٹ ایئر میں تھی۔ مجھے کہا گیا کہ میں گیٹ میٹنگز میں شرکت کروں حالانکہ میں نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ تھی۔

میرے والد نے کہا کہ تمہیں گیٹ میٹنگ میں ضرور جانا چاہیے۔ اس وقت مزدور مختلف فیکٹریوں سے شرکت کرتے تھے کیونکہ وہ بہت زیادہ استحصال سے دوچار تھے۔

میں ان کے علاقوں میں جایا کرتی تھی اور ان کو ٹریڈ یونینز کے بارے میں آگہی دیتی کہ یہ کیوں بنائی جاتی ہیں اور ان کے فوائد کیا ہیں۔ ان کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ان کی ضرورت کیوں ہے۔ میرا اولین مقصد یہ تھا کہ ان کو ٹریڈ یونین کی اہمیت کے بارے میں سمجھایا جائے۔

میں ٹریڈ یونینز میں نہ صرف پاکستان میں بلکہ پورے ایشیا میں پہلی خاتون تھی۔ اپنی غیر موجودگی میں میں شپ یارڈ یونین کی صدر منتخب ہوئی اور جب میں واپس آئی تو ۷۵۰۰ مزدور کراچی شپ یارڈ میں میرے استقبال کو آئے۔

لوگوں کو اس وقت یونینز کے بارے میں کچھ خاص علم نہیں تھا۔ میں مختلف مزدور کالونیوں میں گھر گھر جا کر انھیں قائل کرتی رہی کہ وہ اپنی عورتوں کو ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں میں حصہ لینے دیں اور کام کی جگہ پر اپنے جائز حقوق کو حاصل کریں۔

ور کر یونین کی پہلی خاتون رہنما

صرف ۱۰-۸ فی صد مزدور منظم ہیں اور باقی سب غیر منظم ہیں۔۔۔ سرمایہ دار اور حکومت کا بہت بڑا کردار ہوتا ہے ور کر یونینز کو تشکیل دینے میں تاکہ وہ انھیں اپنے قابو میں رکھ سکیں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ کسی بھی انقلاب کے لیے مردوں اور خواتین کو متحد ہو کر اپنے لیے لڑنا ہو گا۔

جھولی فنڈ

میں نے خواتین مزدوروں کی مختلف صنعتوں میں مزدوروں کے حقوق کے لیے بڑی بڑی ریلیوں کی قیادت کی مثال کے طور پر میں نے جھولی فنڈ کو منظم کیا، برقہ پہنے ہوئی خواتین نے کیماڑی سے لے کر بندر روڈ تک لمبی لمبی قطاروں میں احتجاج کیا، ان سب کی قیادت میں نے کی۔

I HAVE ALL THE POWER

ایک دفعہ بہت طاقتور ڈپٹی کمشنر کراچی نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور کہا کہ اس کے پاس ساری طاقت ہے اور وہ مجھے برباد کر سکتا ہے۔ میں نے اس کے منہ پر پیپر ویٹ دے مارا اور کہا، "میرے پاس ساری طاقت ہے۔ اس کے نتیجے میں مجھے ٹھٹہ شہر بدر کر دیا گیا لیکن میں نے مزدوروں کو دوبارہ منظم کرنا شروع کر دیا۔

خواتین کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس سوچ سے نکالیں کہ وہ کوئی علیحدہ مخلوق نہیں ہیں اور مردوں کے ساتھ برابری کی سطح پر کام کریں۔ میں ہمیشہ سے اس بات کی مخالفت کرتی رہی ہوں کہ عورتوں کے علیحدہ وینگز بننے چاہییں، مرد اور خواتین کو اکٹھے ہو کر کام کے سلسلے میں سب مزدوروں کے مشترکہ فائدے کے لیے ایک پلیٹ فارم پر آنا چاہیے۔

مہناز رحمان

مہناز رحمان کراچی میں پیدا ہوئیں۔ وہ ایک نامور صحافی، ٹریڈ یونین کی نمائندہ اور سرگرم کارکن ہیں جن کا سفر پاکستان کے سیاسی انتشار اور سماجی پس منظر کی عکاسی کرتا ہے۔ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوتے ہوئے وہ ایسے خاندان میں پلی بڑھیں جو تقسیم کے بعد ہجرت کر کے آیا تھا۔ ان کے والدین کی کہانی جو امرتسر اور دہلی سے علیحدہ علیحدہ نکل کر کراچی آئے تھے۔ ان کی شادی ۱۹۴۸ میں اس دن ہوئی جس دن گاندھی کو قتل کیا گیا تھا جو کہ مشکلات کو برداشت کرنے اور مطابقت کی ایک علامت تھا۔

مہناز کا بچپن لاہور، لائل پور/فیصل آباد اور شکارپور میں گزرا جہاں انھوں نے کوہ نور ملز کی صنعتی کالونیوں میں غیر مساوی اور امتیازی سلوک دونوں کے فرق کو محسوس کیا۔ صنعتوں کے ہزاروں مزدوروں کی زندگیوں اور افسروں کی آرام دہ زندگیوں کے مشاہدے سے وہ زندگی کے طبقاتی فرق سے بچپن میں ہی واقف ہو گئی تھیں۔

ان کی سیاسی زندگی کا آغاز کراچی یونیورسٹی سے ہوا جہاں انھوں نے معاشیات میں ایم اے کیا تاکہ سوشلزم کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ ساحر لدھیانوی کی انقلابی شاعری اور چی، کاسترو، لینن، اور ماؤ جیسے بائیں بازو کے عالمی رہنماؤں سے متاثر ہو کر مہناز جلد ہی ایک سٹوڈنٹ رہنما کے روپ میں سامنے آئیں۔ انھوں نے کیمپس میں دقیانوسی سوچ اور جنسی تعصب سے لبریز دماغوں کو للکارا جیسا کہ کچھ اساتذہ کہتے تھے کہ لڑکیاں اپنے رشتے ڈھونڈنے کے لیے یونیورسٹی آتی ہیں، بھٹو کی رہائی کے لیے احتجاج کی قیادت کی، اور اسلامی جمیعت طلبہ کی اجارہ داری کے خلاف آواز اٹھائی۔ رکاوٹوں کو توڑتے ہوئے وہ پہلی خاتون تھیں جو اکنامکس سوسائٹی کا الیکشن جیتیں، جہاں ترقی پسند طلباء ان کی قیادت میں منظم تھے۔ انھوں نے نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن (NSF) کے زیر قیادت احتجاج میں بھی حصہ لیا جس کی وجہ سے انھوں نے ترقی پسند سٹوڈنٹس کی سیاسی مخالفت اور یکجہتی کے خطرے کا براہ راست بیک وقت تجربہ حاصل کیا۔ اس طرح کے ابتدائی تجربات نے ان کی سرگرمیوں اور سوشلسٹ تحریکوں سے وابستگی کو مستحکم کیا۔

۱۹۷۰ ان کی صحافت اور ٹریڈ یونین میں شمولیت کا سال تھا۔ انھوں نے مساوات میں کام کیا جو پی پی پی سے منسلک اخبار تھا اور بعد میں امن اخبار میں کام کیا۔ وہ پہلی اخبار نویسوں کی یونین کی صدر بنیں اور کراچی یونین آف جرنلزم (KUJ) کی جوائنٹ سیکرٹری بھی۔ ان کی سرگرمیاں ضیاء دور کے متصادم تھیں جس کی وجہ سے سینسر شپ، گرفتاریوں اور پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (PFUJ) کے اندر دراڑ اور تقسیم سے صحافیوں پر دباؤ ڈالا جاتا تھا۔ مہناز اور ان کے شوہر، جو خود بھی ایک ٹریڈ یونین کے نمائندے تھے کو شدید معاشی اور سیاسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے شوہر کو روپوش ہونا پڑا اور مہناز کو کم تنخواہ پر گزارہ کرنا پڑا اور سوشلسٹ اخباروں جن کو حکومتی اشتہار نہیں دیے جاتے تھے میں غیر محفوظ نوکریاں کرنا پڑیں۔

ان مشکلات کے باوجود مہناز کی قائدانہ صلاحیت اور جرات قائم رہی۔ انھوں نے یونین کی سرگرمیاں جاری رکھیں اور امن اخبار میں خواتین کے صفحہ کو چلاتی رہیں اور حکومتی دھمکیوں کو برداشت کرتی رہیں۔ ۱۹۸۵ میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ بیجنگ چلی گئیں جہاں سے انھوں نے آٹھ سال تک بڑے پیمانے پر پڑھا جانے والا کالم 'لیٹر فرام بیجنگ' لکھتی رہیں جس نے پاکستانیوں کو چین کے بارے میں جاننے کا موقع فراہم کیا۔ اس کی وجہ سے وہ پہلی پاکستانی خاتون بنیں جنھوں نے چین کا سب سے پروقار ایوارڈ 'فرینڈ شپ ایوارڈ' حاصل کیا۔

مہناز اس بات کی مشکور ہیں کہ ان کے شوہر کی ساتھ نے ان کو جنسی تعصب کی پریشانی سے محفوظ رکھا جبکہ معاشی بدحالی ضیاء کے دور میں بدستور قائم رہی۔ وہ اس بات پر فخر کرتی ہیں کہ انہوں نے اپنے بچوں کی ان نامصائب حالات میں پرورش کی اور وہ اور ان کے شوہر صحافت کی برادری میں احتجاج کی علامت بنے۔ ٹریڈ یونینز کے مستقبل پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ افسوس کرتیں ہیں کہ اس کا زوال نئی آزاد خیالی، نیو لبرلزم، مزدوروں کے غیر رسمی طور پر بنائے گئے کام کے معاہدوں اور اندرونی توڑ پھوڑ اور تقسیم سے ہوا ہے۔ ان کا اس بات پر یقین ہے کہ یونینز صرف تب پنپ سکتی ہیں جب حکومت سماجی بھلائی کی ذمہ داری پوری کرے، لیکن وہ پاکستان میں سوشلسٹ قوتوں کے اتحاد کے بارے میں زیادہ پُر اُمید نہیں ہیں۔

مہناز رحمان کی زندگی متحرک کارکن خواتین کی کاوشوں کے گرد گھومتی ہے جو نہ صرف مزدوروں کے حقوق اور صحافت کی آزادی کے لیے لڑیں بلکہ پاکستان کے بدترین تاریکی آمرانہ سالوں میں ایک ترقی پسندانہ سیاسی تصور کے لیے بھی لڑتی رہیں۔

مفسر: محمد حیان

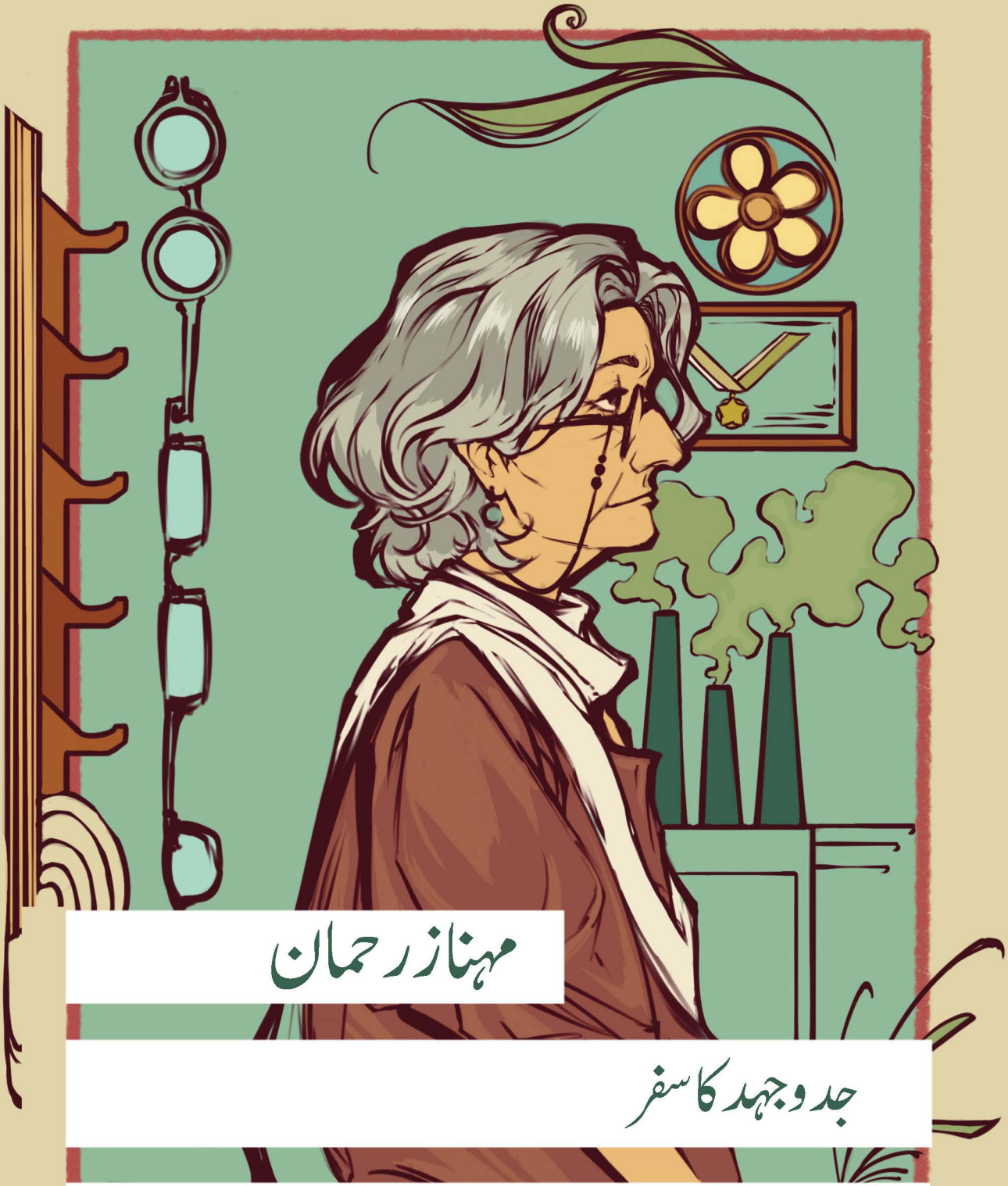

مہناز رحمان

جدوجہد کا سفر

ستوڈنٹ یونین سے صحافیوں کی یونین کی طرف کاوشوں کا سفر

مصنف،
کارکن صحافی

۱۹۴۹

میں پیدا ہوئیں

میں



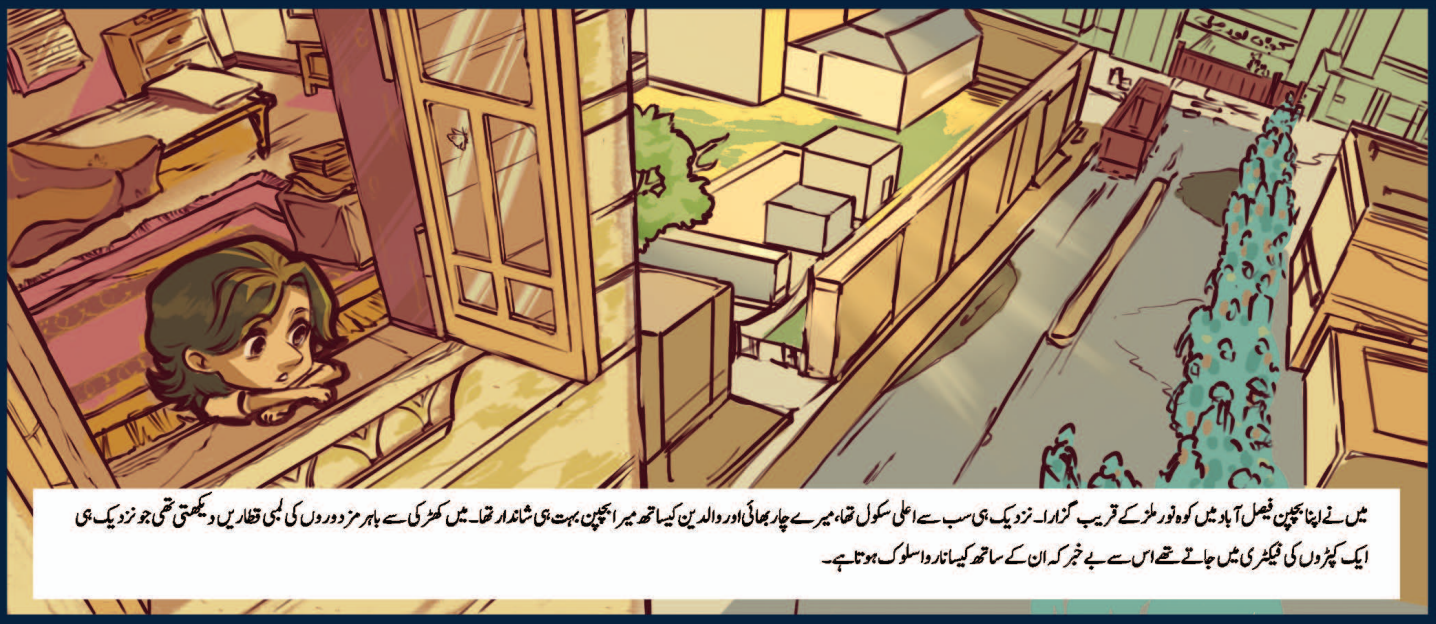

میں نے اپنا بچپن فیصل آباد میں کوہ نور ملز کے قریب گزارا۔ نزدیک ہی سب سے اعلیٰ سکول تھا، میرے چار بھائی اور والدین کیساتھ میرا بچپن بہت ہی شاندار تھا۔ میں کھڑکی سے باہر مزدوروں کی لمبی قطاریں دیکھتی تھی جو نزدیک ہی ایک کپڑوں کی فیکٹری میں جاتے تھے اس سے بے خبر کہ ان کے ساتھ کیسا نارواسلوک ہوتا ہے۔



میں اپنی طرز زندگی کا مزدوروں کی زندگی سے موازنہ کرتے ہوئے ان کی مشکلات کے بارے میں سوچتی تھی۔ جب وہ لمبی قطاروں میں انتظار کرتے تھے اور میں آرام سے سکول جاتی تھی۔

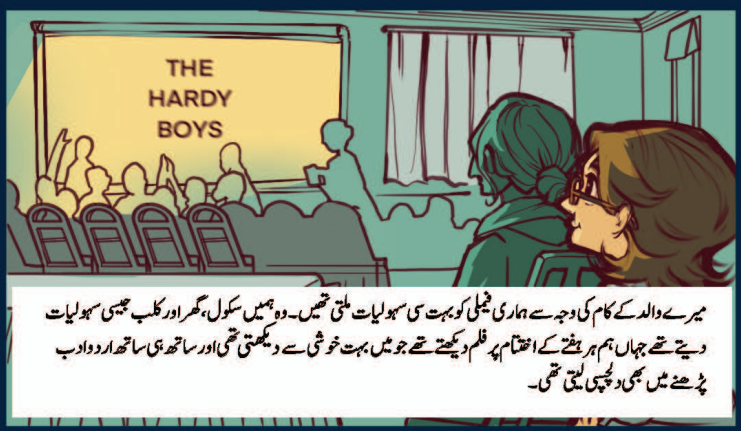

میرے والد کے کام کی وجہ سے ہماری فیملی کو بہت سی سہولیات ملتی تھیں۔ وہ ہمیں سکول، گھر اور کلب جیسی سہولیات دیتے تھے جہاں ہم ہر ہفتے کے اختتام پر فلم دیکھتے تھے جو میں بہت خوشی سے دیکھتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اردو ادب پڑھنے میں بھی دلچسپی لیتی تھی۔



میں شکر گزار تھی کہ میں جیت گئی جس نے مجھے ایک قدم آگے بڑھایا کہ جمعیت مجھے سنجیدگی سے لینے لگی۔ تاہم نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کی جانب سے پوسٹ گریجویٹ کی (NSF) نوکریوں کے لیے احتجاج کی تیاری چل رہی تھی۔



بھٹو اس وقت قید ہو گئے تھے۔ میں اور میرے دوست چھپ کر ان کی رہائی کے پوسٹرز لگاتے تھے۔

میری گہری دوست نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنی قائدانہ صلاحیت کو موثر طریقے سے بروئے کار لاتے ہوئے اکنامکس سوسائٹی کے الیکشن میں کھڑی ہونے والی پہلی لڑکی بنوں۔



مجھ پر اور میری دوستوں پر عورت ہونے کی وجہ سے بہت پابندیاں تھیں اور ہمارے ساتھ بدنامی کو منسلک کیا جاتا تھا جو ہمارے اساتذہ اور انتظامیہ کی طرف سے تھا۔

میں نے اور دیگر لڑکیوں نے دقیانوسی ماحول کے خلاف ہڑتال کی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے کچھ حد تک قائدانہ حیثیت مل گئی ہے۔



میری سرگرمیاں اس وقت شروع ہوئیں جب میں کراچی یونیورسٹی میں معاشیات میں ایم اے کے لیے داخل ہوئی۔ میں سوشلزم کی شاعری کو پسند کرتی تھی۔

جماعت اسلامی اس زمانے میں یونیورسٹی میں اپنے اثر رسوخ اور اپنے نظم وضبط پر نظر رکھنے کے بارے میں پر اعتماد تھی۔



ایک طالب علم نے میرے دوست کے سر پر مارنے کے لیے پتھر اٹھایا، میں نے دیکھ کر چیخ ماری جس سے وہ وہیں رک گیا۔ طلباء کے حقوق کا مطالبہ کرنے پر تشدد کا سامنا کرنے کی یہ ایک مثال ہے۔

اس نے شور کرنے اور الجھاؤ پیدا کرنے کے لیے پھولوں کا گملا پھینکا لیکن پھر اس کی جماعت اسلامی کے لڑکوں نے بہت پٹائی کی۔

میرا ایک دوست NSF کا حصہ تھا اور طلباء نے فیصلہ کیا کہ وہ کانووکیشن کے دن احتجاج کریں گے۔

بعد میں ہم کراچی چلے گئے جہاں مجھے مساوات اخبار نے نوکری دے دی۔

یونینز ہی ایک ایسا پلیٹ فارم تھا جہاں سوشلسٹ سیاست کمیونسٹ بیچپتی دکھا سکتی تھی۔

کمیونسٹ پارٹی کے مزدور روپوش ہو گئے تھے۔

میں یونیورسٹی کے بعد نوکری کے لیے اپنے والدین کے پاس شکارپور چلی گئی لیکن کوئی فائدہ نا ہوا۔

ہماری فیملی قوم پرستوں کے ساتھ کھڑی تھی کیونکہ ہم سوشلسٹ سیاست کا حصہ تھے۔

میں اپنے شوہر کو مساوات اخبار میں ان کی ملازمت کے دوران ملی، وہ ٹریڈ یونین کے سرگرم رکن تھے اور سوشلسٹ سیاست کا حصہ تھے۔

جیسے ہی ضیاء نے ۱۹۷۷ میں حکومت سنبھالی تو مساوات کو بند کر دیا گیا اور میرے شوہر کی نوکری بھی چلی گئی۔

میں نے ابتداء میں آزاد پیشہ ور کے طور پر صحافت کی لیکن بعد میں امن اخبار میں باقاعدہ ملازمت کر لی جو سوشلسٹ رجحان رکھنے والے صحافیوں کا تھا۔

میں امن اخبار کی ایمپلائز یونین کی صدر منتخب ہو گئی۔ میں پہلی خاتون تھی جو اخبار یونین کی صدر بنی۔

میرا امن اخبار میں وقت مشکل گزرا کیونکہ ہم کم تنخواہ پر کام کر رہے تھے، کوئی کام کرنے کے حقوق نہیں تھے اور استحصال بھی ہوتا تھا۔

دفتر کا ماحول بہت کشیدہ تھا، حکومت نے ہماری تقریبات میں جانے پر پابندی لگائی ہوئی تھی۔ میں خواتین کا صفحہ زیادہ تر خود ہی لکھتی تھی۔

دوسرے اخبارات بھی ضیاء الحق کی حکومت نے بند کر دیے تھے۔
ضیاء کی حکومت نے رشوت کے زور پر فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کو تقسیم کر (PFUJ) دیا۔

وہ صحافی جنھوں نے ضیاء کی حکومت کی مخالفت کی انہیں گرفتار کر لیا گیا یا نوکری سے نکال دیا گیا۔

جب مالک مکان کو پتا چلا اس نے ہمیں گھر خالی کرنے کو کہا۔
میں اپنی چھوٹی بچی کے ساتھ اپنے والدین کے گھر چلی گئی۔ ان دنوں بہت تکالیف دیکھیں۔

۱۹۸۵ میں میرے شوہر کو چین میں نوکری مل گئی اور ہم بیجنگ چلے گئے۔

میرے شوہر روپوش ہو گئے تھے تاکہ ضیاء حکومت کے خلاف صحافیوں کی تحریک کو جاری رکھا جا سکے کیونکہ دوسرے صحافی جیل چلے گئے تھے۔

پولیس ان کو ڈھونڈتے ہوئے ہمارے گھر پر آئی تھی۔



آٹھ سال تک میں نے بغیر معاوضہ کے، "لیٹر فرام بیجنگ" کے نام سے کالم لکھا کیونکہ میں محسوس کرتی تھی کہ میں اپنوں سے کٹ گئی ہوں اس لیے پاکستان سے تعلق قائم رکھنا چاہتی تھی۔

ہر ہفتے کالم لکھنے سے مجھے پاکستان سے جڑے رہنے کا احساس رہتا تھا۔ میرا کالم بہت پسند کیا جاتا تھا کیونکہ چین ایسا ملک تھا جو ابھی بھی دنیا سے کٹا ہوا تھا۔



کالم لکھنے نے میرے ارد گرد کے لوگوں پر اور اپنے آپ پر بھی یقین مستحکم کیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ظاہر ہے میرے یقین میں مزید مضبوطی آئی۔

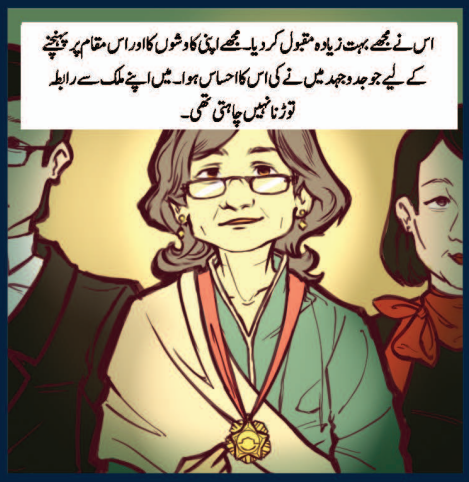

اس نے مجھے بہت زیادہ مقبول کر دیا۔ مجھے اپنی کاوشوں کا اور اس مقام پر پہنچنے کے لیے جو جدوجہد میں نے کی اس کا احساس ہوا۔ میں اپنے ملک سے رابطہ توڑنا نہیں چاہتی تھی۔



میں پہلی اور واحد پاکستانی عورت تھی جسے چین کی حکومت سے ''فرینڈ شپ ایوارڈ'' ملا کیونکہ میری تحریروں سے پاکستانیوں کو چین کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔

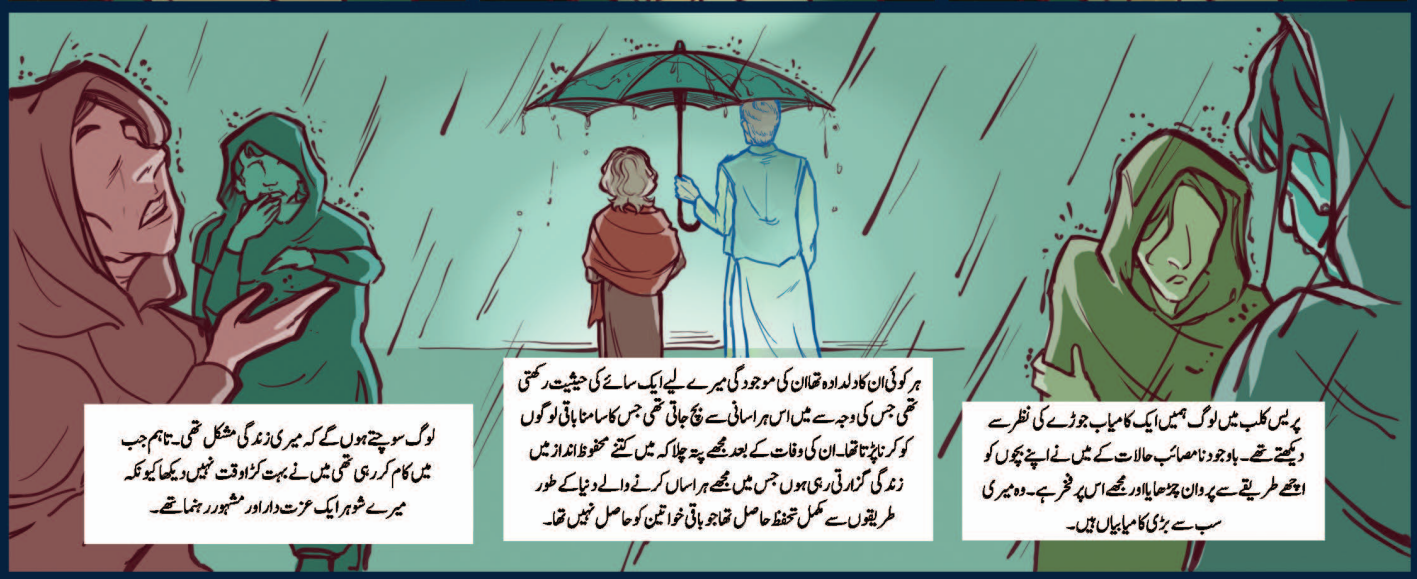

پریس کلب میں لوگ ہمیں ایک کامیاب جوڑے کی نظر سے دیکھتے تھے۔ باوجود نامصائب حالات کے میں نے اپنے بچوں کو اچھے طریقے سے پروان چڑھایا اور مجھے اس پر فخر ہے۔ وہ میری سب سے بڑی کامیابیاں ہیں۔

ہر کوئی ان کا دلدادہ تھا ان کی موجودگی میرے لیے ایک سائے کی حیثیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے میں اس ہراسانی سے بچ جاتی تھی جس کا سامنا باقی لوگوں کو کرنا پڑتا تھا۔ ان کی وفات کے بعد مجھے پتہ چلا کہ میں کتنے محفوظ انداز میں زندگی گزارتی رہی ہوں جس میں مجھے ہراساں کرنے والے دنیا کے طور طریقوں سے مکمل تحفظ حاصل تھا جو باقی خواتین کو حاصل نہیں تھا۔

لوگ سوچتے ہوں گے کہ میری زندگی مشکل تھی۔ تاہم جب میں کام کر رہی تھی میں نے بہت کڑا وقت نہیں دیکھا کیونکہ میرے شوہر ایک عزت دار اور مشہور رہنما تھے۔

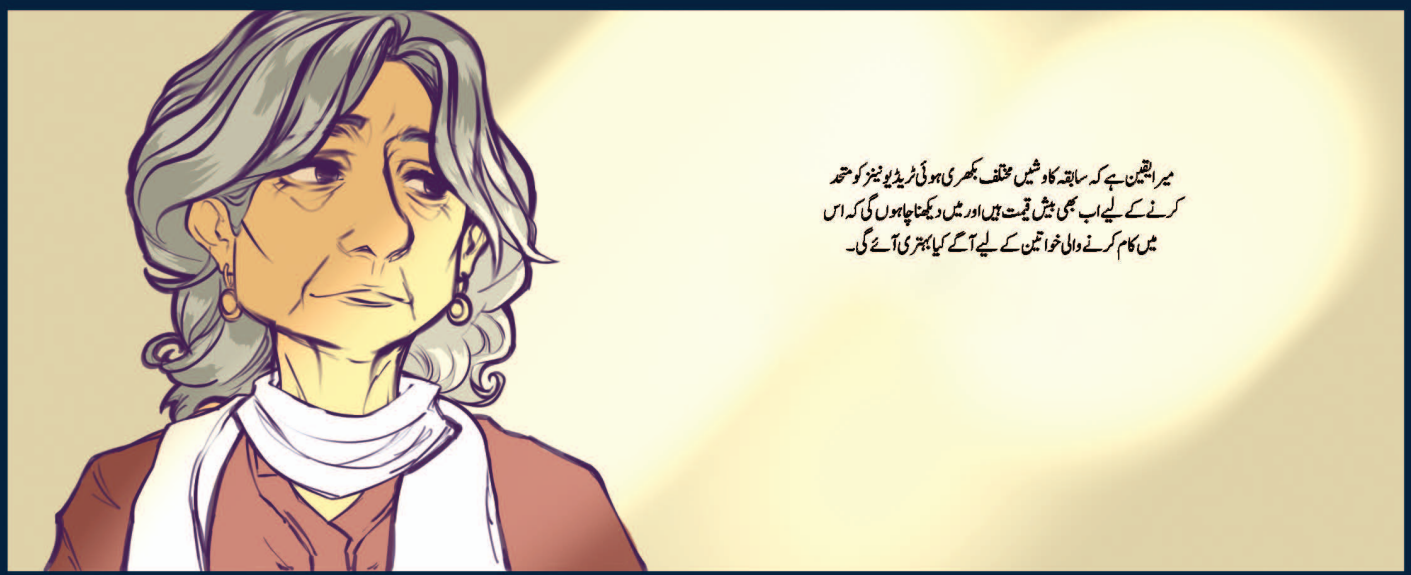

میرا یقین ہے کہ سابقہ کاوشیں مختلف بکھری ہوئی ٹریڈ یونینز کو متحد کرنے کے لیے اب بھی بیش قیمت ہیں اور میں دیکھنا چاہوں گی کہ اس میں کام کرنے والی خواتین کے لیے آگے کیا بہتری آئے گی۔

مسرت جبین

کراچی میں پیدا ہونے والی اور پلنے بڑھنے والی مسرت جبین ایک اشرافیہ سے متوسط طبقے میں بدل جانے والے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھیں مگر پھر انھوں نے بی اے کر لیا۔ وہ غیر شادی شدہ رہیں اور انھوں نے اپنی زندگی مزدوروں کے حقوق، اپنی ماں، بہن اور معذور بھانجی کی دیکھ بھال کے لیے وقف کر دی، اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی انفرادی حیثیت ٹریڈ یونین کی تحریک میں بنالی۔ ان کو اپنے والد کی طرف سے مزدوروں کے حقوق کے حوالے سے زبردست حمایت حاصل رہی۔

ان کی مزدوروں کے ساتھ جدوجہد اس وقت شروع ہوئی جب انھوں نے انٹرنیشنل فاؤنڈیشن گارمینٹس (IFG) میں کام شروع کیا جو ایک بوہری خاتون چلا رہی تھیں اور وہ یونین سازی کے حق میں تھیں۔ باوجود اس کے کہ خواتین کے ذاتی اندرونی استعمال کے کپڑوں کی فیکٹری میں کام کرنے والی خواتین کو سماج میں معیوب تصور کیا جاتا تھا، مسرت کو قیادت کرنے کا حوصلہ اور پلیٹ فارم ملا۔ وہ جلد ہی بے باک اور بے خوف رہنما کے طور پر ابھریں جن پر ساتھی مزدور خواتین ان کی قیادت اور تنازعات کو سلجھانے کی صلاحیت پر بھروسہ کرتی تھیں۔ PILER سے ٹریننگ اور کراچی کے سلیم رضا اور کرامت علی جیسے رہنماؤں کی زیر تربیت وہ اپنی IFG یونین کے جنرل سیکرٹری کے عہدے تک پہنچ گئیں اور تقریباً دو دہائیوں تک مسلسل الیکشن جیتتی رہیں۔ وہ کراچی کی مختلف ٹریڈ یونینز کے ساتھ بھی منسلک رہیں اور نیشنل ٹریڈ یونین فیڈریشن (NTUF) کی خواتین ونگ کی رہنما رہیں۔

مسرت کا سفر دھوکہ دہی اور تشدد سے لبریز رہا۔ فیکٹری انتظامیہ جعلی "پاکٹ یونینز" کے ذریعے اصل یونینز کی سرپرستی کرتی رہیں کہ ان کو کمزور کر سکیں جبکہ فائدہ اٹھانے والے ساتھی مزدور دوسرے مزدوروں کے حقوق کا سودا کرتے رہے۔ وہ فیکٹری کینٹین میں ایک قاتلانہ حملے میں بال بال بچیں، اپنے پر کی گئی کردار کشی کا سامنا کیا، اور سخت ترین مخالفت برداشت کی لیکن وہ ثابت قدم رہیں۔ "میں نے کوئی سودے بازی نہیں کی۔ میں کام کرتی رہی، میں نے نقصان اٹھائے، لیکن میں مطمئن ہوں۔"

ان کی سب سے نمایاں کامیابیوں میں تنخواہوں میں اضافہ، تنخواہوں کی مد میں اضافی انعام، سہولیات، مہارت کو بہتر کرنے کے پروگرام اور مزدوروں کا احترام شامل ہیں۔ جس میں ایک صفائی والے سے لے کر فیکٹری کو چلانے والے سٹاف تک سب شامل ہیں۔ مزدوروں کے خاندان انھیں یاد رکھتے ہیں کیونکہ وہ خوشی اور غم میں ان کے ساتھ کھڑی رہیں۔ انھوں نے اعتماد اور بھروسہ کی فضاء پیدا کی اور اپنے آپ کو نوجوان خواتین کے لیے ایک مثالی کردار بن کر دکھایا۔

آج مسرت ٹریڈ یونینز کے حالات سے مایوس نظر آتی ہیں۔ وہ بہت سی ٹریڈ یونین فیڈریشنز کو کمزور دیکھتی ہیں جن کی وجوہات ان کے نزدیک، بدعنوانی، کچھ NGOs کا جعلی یونینز کے ساتھ مل جانا، اور مزدوروں کے حقوق ٹھیکے پر کام کرنے اور مہنگائی کی وجہ سے تباہ ہو جانا ہیں۔ جہاں پہلے یونینز مضبوط ہوتی تھیں کہ وہ مالکان اور لیبر ڈیپارٹمینٹ سے حساب مانگتی تھیں اب انہیں وہاں خاموشی اور خوف نظر آتا ہے۔

ان کا نوجوان نسل کو پیغام ہے: "اپنے لیے لڑو۔ یہ آسان نہیں ہے لیکن صرف اصلی یونینز ہی جو پاکٹ یونینز نا ہوں وہی مزدوروں کو وقار اور حقوق واپس دلوا سکتی ہیں۔"

مفسر: ایمان حبیب

مسرت جبین



نامساعد حالات کے بہاؤ کے خلاف
فرد واحد کی جدوجہد


اگر ہم خاموش رہے تو
ہمارے لیے کچھ بھی نہیں
بدلے گا۔
ifg
وہ اوروں سے
مختلف ہے انتظامیہ
سے نہیں ڈرتی
میرے والد نے مجھ سے کہا"
اخلاقی اصولوں کا پاس رکھنا اور
درست کام کرنا سب سے اعلی
ترجیح ہے چاہے اس سے تاخیر ہی
کیوں نا ہو"
ور کرز یونین کی صدر
چھوٹی عمر سے ہی وہ ناانصافی
کے خلاف کھڑی ہوئی۔


ہم یہاں ہر مزدور کے لیے اس کی بہتر اجرت، اضافی انعام، اور وقار کے لیے لڑیں گے۔
میں مزدوروں کے حقوق کو پیسوں کے لیے نہیں بیچوں گی! کبھی نہیں!
اس کی ٹیم کو توڑ دو ہمیں اس پر قابض ہونا ہے۔
وہ مجھے دھمکا سکتے ہیں لیکن میں رکوں گی نہیں
مسرت! ہم تمہارے ساتھ کھڑے ہیں


مزدوروں کے بچے میرا نام جانتے ہیں۔ یہی اصل فتح ہے۔
آنے والی نسل کو ہم سے زیادہ بہادر، آواز اٹھانے والا، مضبوط ہونا چاہیے۔

نصرت بشیر

سیالکوٹ میں پیدا ہونے والی نصرت بشیر ظفر لاہور میں ایسے گھرانے میں پلی بڑھیں جو ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں بھرپور طریقے سے عمل پیرا تھا۔ ان کے والد بشیر ظفر جو ایک مشہور یونینسٹ تھے اور پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے سابقہ صدر تھے وہ ان کے سب سے پہلے استاد تھے۔ بچپن سے ہی وہ ان کے ساتھ احتجاجوں اور جلسے جلوسوں میں مزدوروں کے حقوق کے لیے نعرے مارتے ہوئے جاتی تھیں۔

نوعمری میں ہی نصرت مزدوروں کو متحرک کر رہی تھیں۔ ۱۹۸۹ میں انھوں نے لاہور کی مال روڈ پر ۳۰۰۰ لوگوں کے ایک بڑے مجمعے کے احتجاج میں حصہ لیا جو کہ جبری مشقت کے خاتمے سے متعلق ۱۹۹۲ کے قانون کے لیے اہم ثابت ہوا۔ جلد ہی انھوں نے مختلف شہروں میں یونینز کی بنیاد رکھی جس کی وجہ سے پاکستان بھٹہ مزدور فیڈریشن کی بنیاد پڑی۔

ایک تربیت یافتہ وکیل کے ساتھ ساتھ پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کے ہوتے ہوئے نصرت قانونی مہارت کے ساتھ سیاسی سرگرمیوں کی جڑوں کو آپس میں جوڑ لیتی تھیں۔ وہ بھٹہ مزدوروں کی نمائندگی کرتی ہیں جو کہ پاکستان کے سب سے زیادہ استحصال زدہ مزدور ہیں۔ یہ اکثر قرضوں کے گھن چکر میں پھنسے ہوتے ہیں جہاں سارا خاندان بشمول بچوں کے قرض اتارنے کے لیے مشقت کرتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ وہ خواتین جو محنت کرتی ہیں ان کو مزدور کا رتبہ دیا جائے اور ان کی تنخواہیں خاندان کے مردوں کے بجائے ان کے نام پر ان کو از خود ملیں۔

ان کی کاوشیں بھٹوں تک محدود نہیں: وہ لیبر الائنس میں بھی پیش پیش ہیں جہاں وہ مزاحمت کرتی ہیں ایسے عمل کے خلاف جو کہ مزدوروں کے حقوق کی پامالی کرتا ہے۔ جب مزدوروں کے قوانین کو ٹھیکیداروں کے وضع کردہ غلط ضابطوں سے ملا دیا جاتا ہے۔ فیڈریشن اور مزدوروں کو متحرک کرنے کی کوششوں میں انھوں نے اپنا گھر تنظیم کے مرکز میں تبدیل کر دیا ہے اور مزدوروں کی قانونی جنگ میں ان کی تنخواہوں، حفاظت، اور وقار کے لیے مسلسل لڑ رہی ہیں۔

نصرت محسوس کر رہی ہیں کہ خواتین کی یونینز میں شرکت ابھی بھی محدود ہے جو کہ مالکان اور حکام کے خوف اور ان کے اپنے خاندان کی وجہ سے ہے۔ پھر بھی وہ خواتین کو قدم بڑھانے کا حوصلہ دیتی ہیں۔ "اگر ہم اپنے حقوق کے لیے نہیں بولیں گیں تو ہم ان محدود مراعات جو ہمیں حاصل ہیں انھیں بھی کھونے کا خطرہ مول لے لیں گی۔"

وہ اپنے دونوں کرداروں پر فخر کرتی ہیں۔ ایک عدالت میں مقدمات لڑنا اور دوسرا سڑکوں پر احتجاج کی قیادت کرنا۔ ان کے خیال میں یہ دونوں میدان انصاف حاصل کرنے کے لیے ناگزیر ہیں۔

"میرے والد نے مجھے مزدوروں کی جدوجہد کی مشعل سونپی تھی۔ میں اس کو آگے لے کر جاتی رہوں گی۔ مزدوروں کے لیے اور خاص طور پر عورتوں کے لیے جن کی آوازوں کو اکثر خاموش کرا دیا جاتا ہے۔"

مستقبل کے بارے میں پرامید نصرت جبری مزدوری، بچوں کی مشقت، ہراسانی، اور اجرتوں میں تفریق کے لیے اپنی جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی قیادت نسلوں کے درمیان فاصلوں کو کم کر رہی ہے اور بھٹہ مزدوروں کی تحریک کو قانونی و سیاسی تقویت دے رہی ہے۔

مفسر: اریبہ شوکت قریشی

نصرت بشیر

بھٹہ مزدوروں کے لیے قانونی اور سیاسی جدوجہد

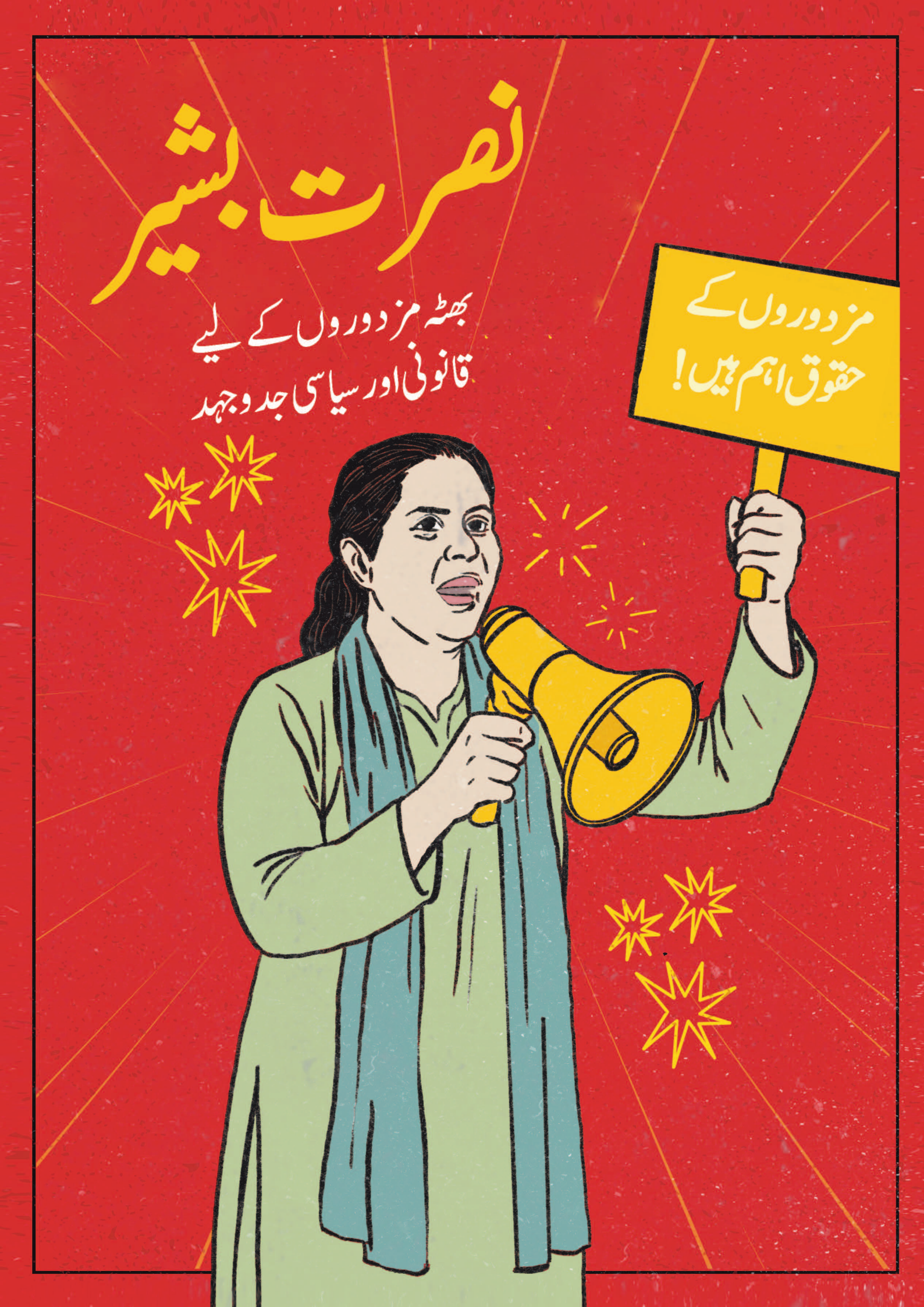

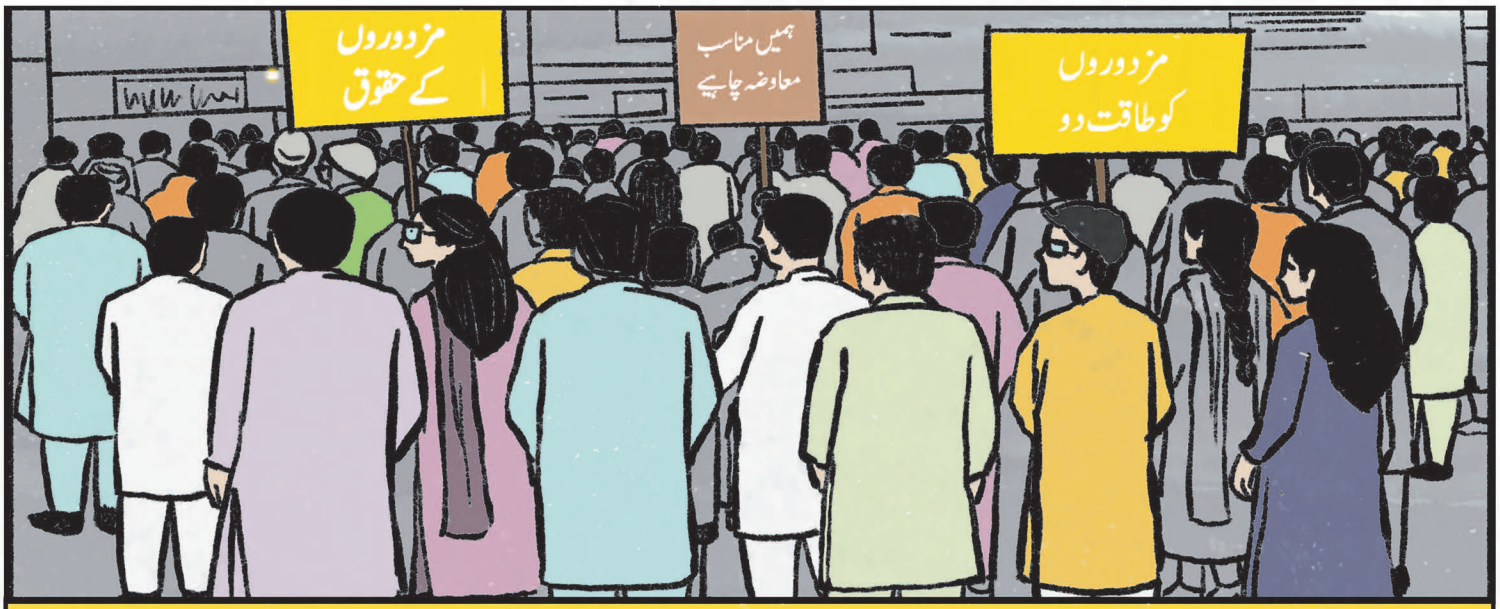

نصرت جلسے جلوسوں اور یونین کی تقریروں کے درمیان پلی بڑھیں۔



میں مزدوروں کے مسائل سے بچپن سے ہی آگاہ ہو گئی تھی کیونکہ میرے والد ہمیں اجلاسوں اور احتجاجوں میں ساتھ لے جاتے تھے۔



اینٹوں کے بھٹوں کے جبری مزدوروں کی آوازیں گونجنا شروع ہو گئی تھیں۔ ۱۹۸۹ میں ہم نے لاہور مال روڈ پر ایک بڑا احتجاج کیا اور اس میں ۲۵۰۰ سے ۳۰۰۰ لوگ تھے۔ عاصمہ جہانگیر بھی اس میں حصہ لے رہی تھیں۔



ہم نے مختلف شہروں میں پہلے سے ہی یونینز بنانی شروع کر دی تھیں اور پھر فیڈریشن ۱۹۹۰ میں بنائی۔ فیڈریشن قانونی طور پر ۱۹۹۲ میں رجسٹر ہوئی تھی جب جبری مشقت کا قانون آیا تھا۔

اینٹوں کے بھٹوں کے نظام میں خواتین کو پیسے نہیں ملتے۔ جو بھی کام کرتا ہے اسے ہی اس کا معاوضہ ملنا چاہیے۔

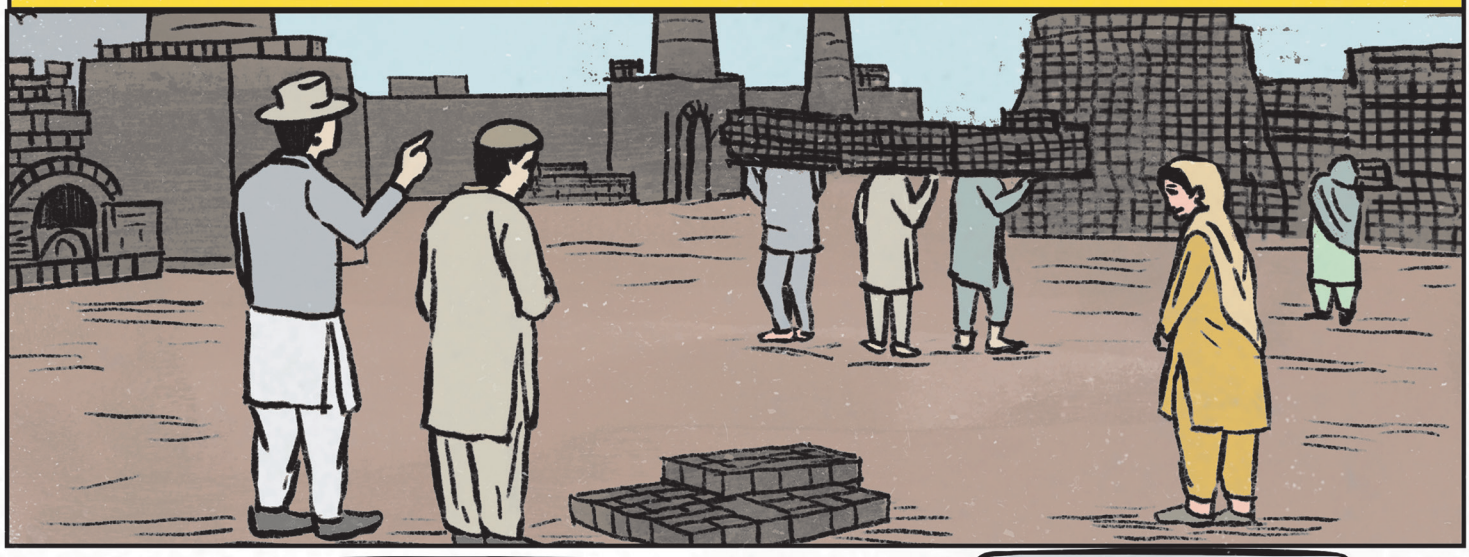



نصرت کے کمرے میں ۱۵-۲۰ لوگ لیبر الائنس اجلاس کے لیے اکٹھے ہوئے۔

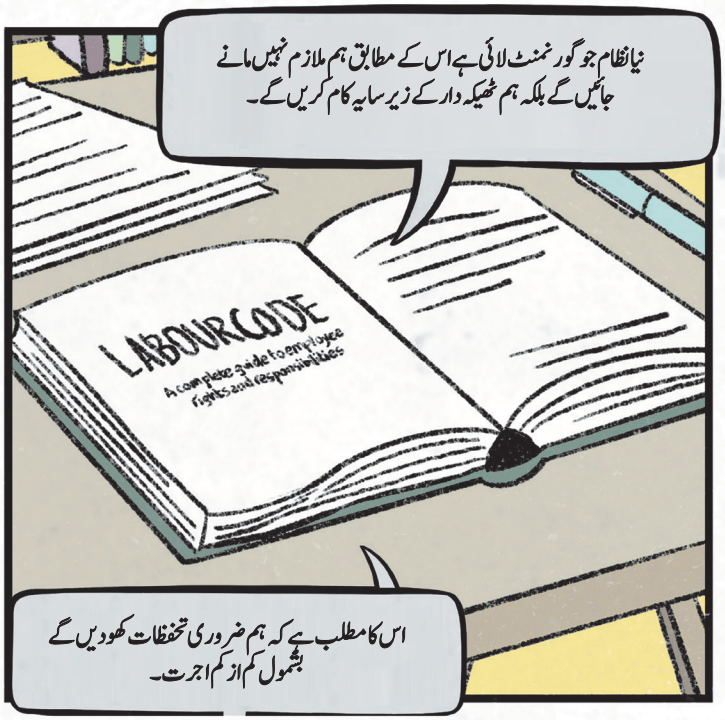



میری وکالت میں بہت سارے مزدوروں کے مقدمے
اور گھریلو تشدد کے مقدمات بھی شامل ہیں۔

ذرائع ابلاغ نے بہت سے لوگوں کو سمجھایا ہے کہ ہراساں کرنا کیا
ہوتا ہے، اس کی کیا سزائیں ہیں اور عورت کو اس کی شکایت کے
لیے کہاں جانا چاہیے۔



بچوں سے مشقت کرانے کا کام بڑھتا جا رہا ہے اور اس سے نمٹنے
کے لیے دباؤ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔



میں ٹریڈ یونینز کو مضبوط کرنے اور مزدوروں کے حقوق کے
لیے بدستور کام کرتی رہوں گی۔



مال روڈ کے احتجاجوں سے لے کر پارلیمانی مباحث تک نصرت
کی آواز دبنے سے انکاری ہے۔

پروین لطیف انصاری

فیصل آباد میں پیدا ہونے والی پروین لطیف انصاری محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والے گھرانے میں پلی بڑھیں جہاں لڑکیوں کی تعلیم کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ان کے والد جو ایک پاور لوم کے مزدور تھے،انہوں نے شروع میں ان کی پرائمری سکول سے آگے پڑھنے کی مخالفت کی۔ لیکن ان کے اساتذہ اور ان کے نانا نانی کے تعاون کی بدولت وہ اسلامک سٹڈیز میں ایم اے کر کے استانی بن گئیں۔

پروین کی زندگی نے فیصلہ کن موڑ اس وقت لیا جب ان کی شادی لطیف انصاری سے ہوئی جو کہ ٹریڈ یونین کے رہنما تھے۔اپنی شادی کے دن ان کا لیبر تحریک میں خیر مقدم کیا گیا،اگلی ہی صبح انھوں نے مزدوروں کے جلسے میں تقریر کی۔تب سے انھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ مزدوروں کے حقوق کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور اکثر ان کی جگہ پر بھی کام کرتیں تھیں۔

ان کا عزم اور استقلال اس وقت سامنے آیا جب لطیف کو حکام سے مذاکرات کے دوران گولی لگی اور وہ شدید زخمی ہو گئے۔جب وہ روبہ صحت ہو رہے تھے تو پروین نے اپنا کردار خوبی سے ادا کیا اجلاسوں میں شرکت کی، درخواستیں دائر کیں اور لیبر کے محکمے کے طریقہ کار کو سمجھا۔ان تجربات نے انھیں ایک استانی سے پر اعتماد یونین کارکن بنا دیا۔

وہ دل کی گہرائیوں سے اینٹوں کے بھٹوں کے مزدوروں اور پاکستان لیبر قومی موومینٹ کی ان خواتین اور خاندانوں کو متحرک کرنے میں جٹ گئیں جو شدید استحصال کا شکار تھیں۔بعد میں انھوں نے مشترکہ طور پر ۲۰۲۱ میں ویمن ورکرز الائنس بنائی،ایک اجتماعی کوشش جس سے مختلف شعبوں سے خواتین کو اکٹھا کیا گیا جو کہ صفائی کرنے والیاں، کپڑے بنانے والیاں، تعلیم اور اینٹوں کے بھٹوں کے شعبوں سے منسلک تھیں تاکہ کام کی جگہ پر ہراساں کرنا،ٹراسپورٹ کی تکلیفیں، کام کرنے کے طویل گھنٹے،اور غیر منصفانہ برطرفیوں کا تدارک کیا جا سکے۔

پروین نے خواتین مزدوروں کے حقوق پر توجہ دی،انھوں نے تشدد اور ناانصافی کے مقدمے بہادری سے لڑے اور اس بات کو یقینی بنایا کہ خواتین مزدور بحال کی جائیں یا ان کی تلافی کی جائے۔ انھوں نے باور کرایا کہ خواتین کو ان جگہوں تک رسائی حاصل ہے جہاں مزدوروں کو بھی حاصل نہیں" : جیسے میں ایک عورت ہونے کے ناطے کسی گھر میں جا سکتی ہوں ان کے مسائل سن سکتی ہوں مگر مرد رہنمائوں کے لیے یہ مشکل ہے۔"

ان کی جدوجہد کی کامیابیوں میں بیواؤں کے لیے معاوضے کا بندوبست کرنا، فیکٹریوں میں ہراساں کرنے کے خلاف بنی کمیٹیوں کے لیے لڑنا اور ان باتوں کو بے نقاب کرنا جن سے خواتین کا استحصال کرنے کے لیے انھیں چھپایا یا خاموش رکھا جاتا ہے شامل رہا ہے۔

"خواتین کو رہنما بننے کے لیے اعلی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔پختہ یقین اور جرأت ہی کافی ہیں۔جن خواتین سے میں روزانہ ملتی ہوں وہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔"

پروین ایسی تحریک کا خواب دیکھتی ہیں جس میں خواتین مزدور مردوں کے شانہ بشانہ کھڑی ہوں،علامتی طور پر نہیں بلکہ رہنما بن کر جو پاکستان کی ٹریڈ یونینز کے مستقبل کی شکل بدل دیں۔

مفسر: عزقہ عظیم

پروین لطیف انصاری

ایک اُستانی سے ٹریڈ یونین کارکن بننے تک۔



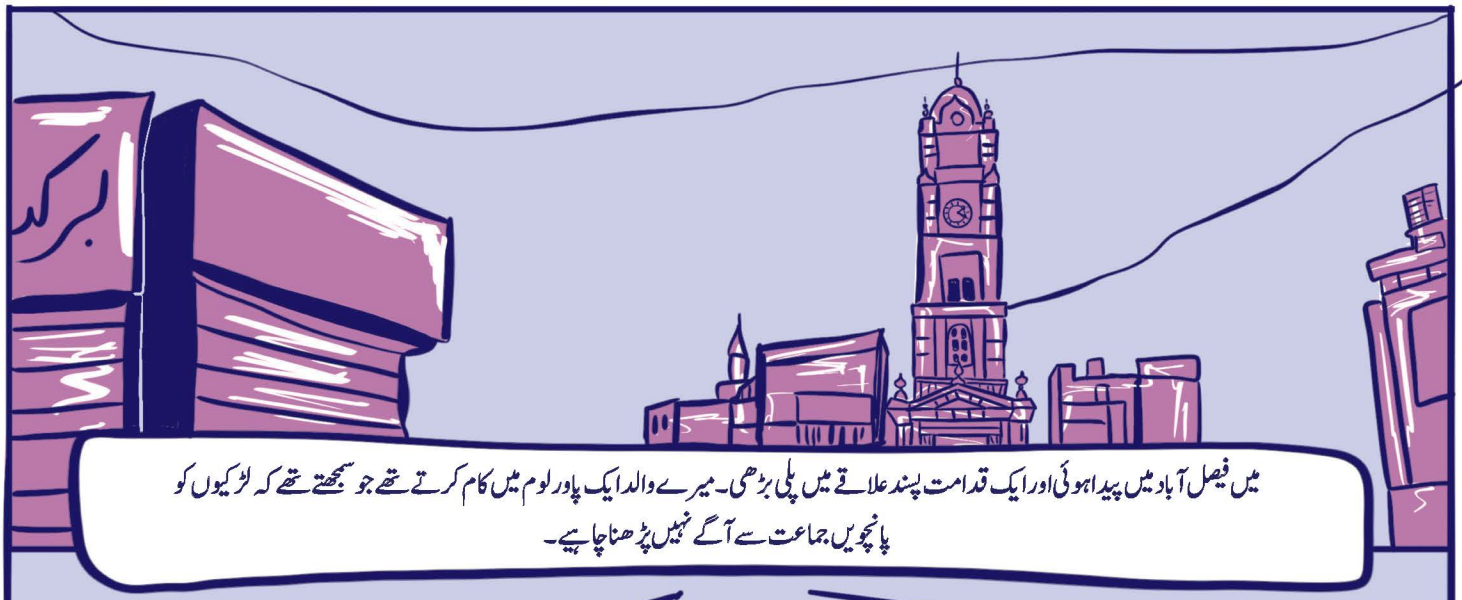

میں فیصل آباد میں پیدا ہوئی اور ایک قدامت پسند علاقے میں پلی بڑھی۔ میرے والد ایک پاور لوم میں کام کرتے تھے جو سمجھتے تھے کہ لڑکیوں کو پانچویں جماعت سے آگے نہیں پڑھنا چاہیے۔



میں ایک ذہین طالبہ تھی۔۔۔ میرے اساتذہ نے میرے والد کو قائل کیا کہ مجھے آگے پڑھنے دیں۔



میرے نانا میرے لیے کتابیں لے آئے اور میری حوصلہ افزائی کرتے رہے اس وقت تک جب تک میں نے ماسٹرز اسلامیات میں کر لیا۔



میں نے پڑھانا شروع کر دیا ان سکولوں میں جہاں مزدوروں کے بچے پڑھتے تھے۔



جس دن میری شادی ہوئی اسی دن میں ٹریڈ یونین کی تحریک میں شامل ہو گئی۔



۲۰۱۲ میں، میں نے ٹریڈ یونین کے رہنما لطیف انصاری سے شادی کر لی۔ میری شادی پر میری استاد نے اس بات پر زور دیا کہ میں شادی کے بعد بھی متحرک رہوں۔

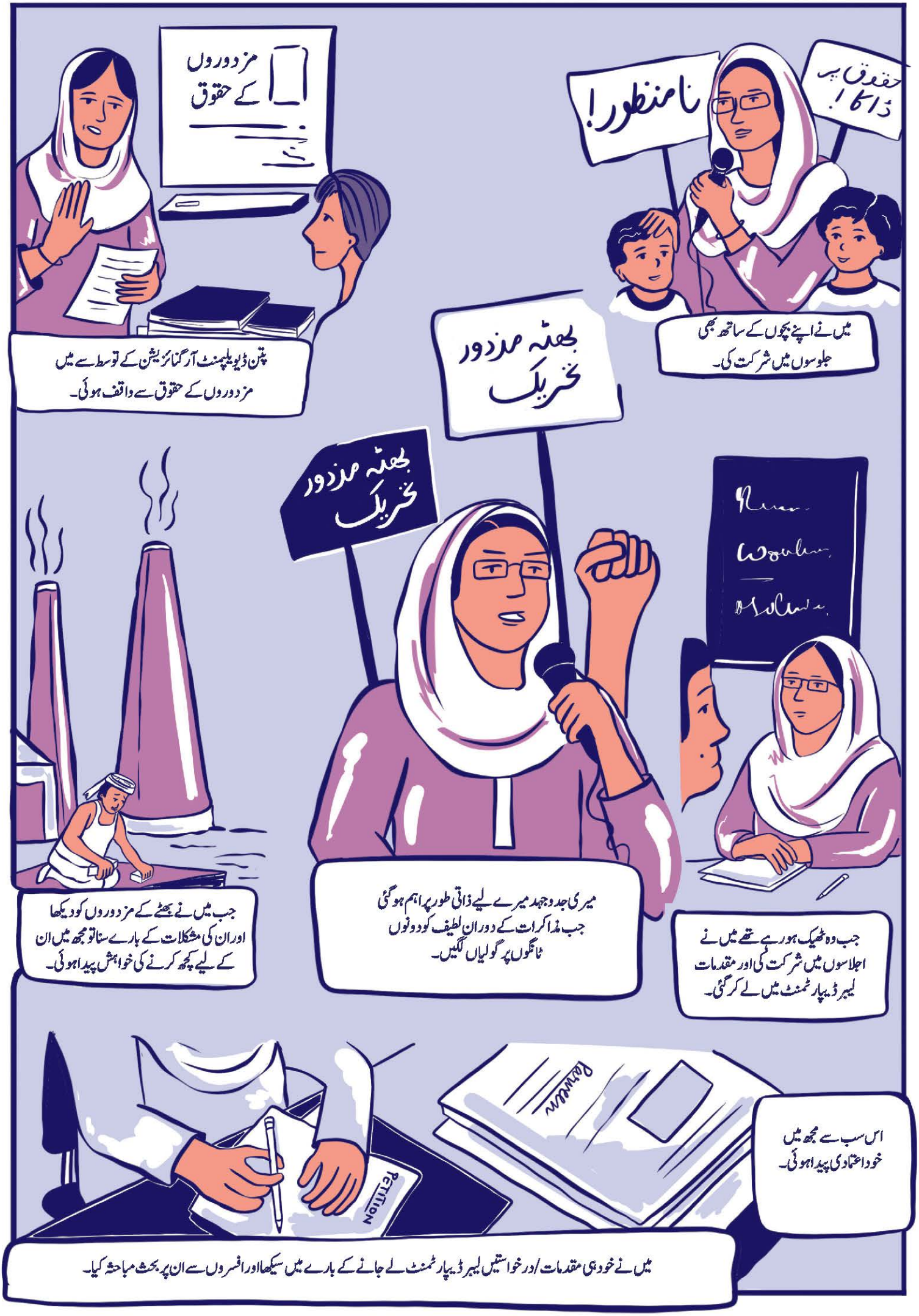
مزدوروں کے حقوق
پتن ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے توسط سے میں مزدوروں کے حقوق سے واقف ہوئی۔
نامنظور!
حقوق پر ڈاکا!
میں نے اپنے بچوں کے ساتھ بھی جلوسوں میں شرکت کی۔
بھٹہ مزدور تحریک
بھٹہ مزدور تحریک
جب میں نے بھٹے کے مزدوروں کو دیکھا اور ان کی مشکلات کے بارے سنا تو مجھ میں ان کے لیے کچھ کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔
میری جدوجہد میرے لیے ذاتی طور پر اہم ہو گئی جب مذاکرات کے دوران لطیف کو دونوں ٹانگوں پر گولیاں لگیں۔
جب وہ ٹھیک ہو رہے تھے میں نے اجلاسوں میں شرکت کی اور مقدمات لیبر ڈیپارٹمنٹ میں لے کر گئی۔
PETITION
اس سب سے مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔
میں نے خود ہی مقدمات/درخواستیں لیبر ڈیپارٹمنٹ لے جانے کے بارے میں سیکھا اور افسروں سے ان پر بحث مباحثہ کیا۔

۲۰۲۱ میں میں نے مختلف شعبوں کی خواتین کو متحد کر کے ان مشکلات کا سدباب کرنے کے لیے جو کام کی جگہ پر خواتین کو درپیش ہوتی ہیں جیسے ہراساں کرنا اور غیر منصفانہ برطرفیاں ایک خواتین ورکرز الائنس بنایا

ہراسانی کے خلاف کمیٹیوں کی عدم موجودگی سے بہت سے مردوں کو لگتا تھا کہ انھیں استثنیٰ حاصل ہے۔

میں نے ایک ۲۷ سالہ ہراسانی کی شکار مزدور کو نوکری پر بحال کروایا جو برطرف ہو چکی تھی اور اسے ۱۱ لاکھ کے واجبات دلوائے، لیبر انسپکٹرز کو فیکٹریوں کے اندر اس افسوسناک ماحول سے آشنا کروایا جس میں خواتین مزدور کام کرتی ہیں، مگر وہ آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے۔

خواتین کا یونین رہنما بننے کے لیے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا ضروری نہیں ہے۔

میں نے ایک بیوہ کو ۷۰ لاکھ کی انشورنس دلوانے میں مدد کی۔

حق

عورت مضبوط

"آ" سے آزادی

استاد سے مزدوروں کے لیے ایک نڈر آواز تک کا میرا سفر ثابت کرتا ہے کہ پختہ ارادہ زندگیاں بدل سکتا ہے۔

ریحانہ یاسمین

کراچی میں پیدا ہونے والی ریحانہ یاسمین کی زندگی ابتداء سے ہی مشکلات سے دوچار رہی۔ انہوں نے اپنی ماں کو چار سال کی عمر میں ہی کھو دیا اور ان کو دسویں جماعت کے فوراً بعد کام شروع کرنا پڑا کیونکہ ان کے والد بیمار ہو گئے تھے۔ اپنے آپ کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے وہ پر عزم تھیں اس لیے تمام مشکلات کے باوجود گھر کو چلانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے بی۔ اے کیا۔ انہوں نے شادی کی مگر جلد ہی بیوہ ہو گئیں اور اپنی بیٹی کو اکیلے ہی پالا۔

ان کے شروع کے کاموں میں لیاقت نیشنل ہسپتال میں نرسنگ، گھر سے ہی فراکوں کی سلائی، اور پڑھانا شامل ہیں، یہ سب انہوں نے اپنی بیٹی کو پالنے کے ساتھ ساتھ کیا۔ گھر سے روزانہ جلدی باہر جانے کی وجہ سے شک کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی بیٹی کو مضبوط، خود مختار اور نڈر بنائیں گیں۔

ریحانہ کی زندگی میں اہم موڑ تب آیا جب وہ پاکستان انسٹیٹیوٹ آف لیبر ایجوکیشن اینڈ ریسرچ (PILER) کے ٹریننگ پروگرام میں شامل ہوئیں۔ مزدوروں کے حقوق کے بارے میں جاننے کے بعد ان کا نظریہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ انہوں نے گھر سے کام کرنے والی اپنے علاقے کی خواتین کو منظم کرنا شروع کر دیا، اور ان کے لیے ہر ایک کپڑے کے نامناسب داموں پر ٹھیکیداروں کے برے رویے اور ان کی زبان درازی اور بداخلاقی پر اور اجرتوں کے خلاف لڑائی کی۔ ان کی پہلی کامیابی تب ہوئی جب انہوں نے خواتین کو راضی کر لیا کہ وہ متحد ہو کر ٹھیکیدار سے زیادہ معاوضے کا مطالبہ کریں گیں۔

۱۹۹۶ میں انہوں نے مشترکہ ہوزری گارمینٹ ٹیکسٹائل ورکرز جنرل یونین بنائی اور جانتے بوجھتے ہوئے اسے "جنرل یونین" کا نام دیا تاکہ فیکٹریوں کا دائرہ کار بڑھا کر مزدوروں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو تحفظ دیا جاسکے۔ ان کی قیادت میں یونین ممبرز کی تعداد سن ۲۰۰۰ میں ۵۰۰ سے بڑھ کر سن ۲۰۱۰ میں ۲۰۰۰۰ تک ہو گئی جو کراچی، حیدر آباد، اور نواب شاہ تک پھیل گئی۔

ریحانہ اس تاریخ ساز جدوجہد میں آگے آگے تھیں جس میں علی انٹرپرائزز میں آگ کے حادثے کا شکار ہونے والے پانچ افراد کی فیملیز کی مدد کر کے انھیں معاوضہ دلوانے، اور کام کی جگہ پر تشدد اور ہراساں کرنے کے خلاف لڑنا، شامل ہے۔ وہ خواتین کو بولنے کی جرأت پیدا کرنے کے لیے جانی جاتی ہیں (بولو! اپنی آواز اٹھاؤ)، اور خاندانوں کو آمادہ کرتی ہیں کہ وہ اپنی خواتین کو یونینز میں حصہ لینے دیں۔

ان کا سب سے بڑا فخر ان کی بیٹی ثناء رباب ہے۔ ثناء نے اعلی تعلیم حاصل کی، نوجوانوں کے بین الاقوامی پروگراموں میں حصہ لیا اور اب دوسروں کو مضبوط اور پڑھی لکھی خاتون ہونے کا شوق پیدا کرنے پر زور دیتی ہے۔

"میں نے خاموشی کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا۔ اگر عورتیں نہیں بولیں گی تو پھر انھیں کوئی بھی نہیں سنے گا۔ ایک اجتماعی آواز ہی ہماری طاقت پنہاں ہے۔"

ریحانہ کے لیے خود مختاری ذاتی اور مجموعی دونوں ہیں۔ وہ خواتین مزدوروں کی آنے والی نسلوں کو پڑھانے اور تربیت دینے کا خواب دیکھتی ہیں تاکہ وہ اپنے حقوق اور وقار کے لیے لڑ سکیں۔

مفسر: ایمن سلیم

ریحانہ یاسمین

"منظم کرنے سے لے کر خود مختاری تک"




میں نے اپنی ماں کو چار سال کی عمر میں کھو دیا، میرے والد بیمار تھے،
صرف میرا بھائی اور میں تھے، زندگی نے ہم سے چاہا کہ ہم وقت سے پہلے
ہی بڑے ہو جائیں۔


میرے شوہر شادی کے ۵ سال بعد فوت ہو گئے جب میری بیٹی
صرف چھ ماہ کی شیر خوار بچی تھی۔

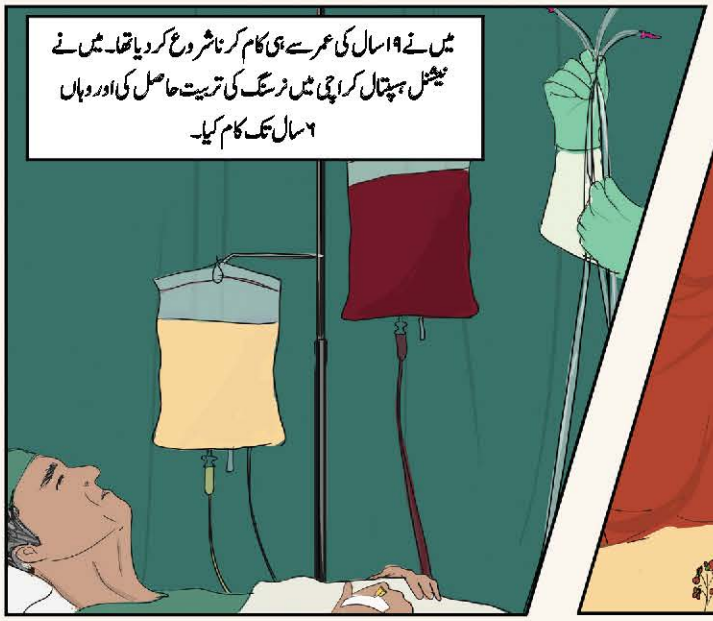
میں نے ۱۹ سال کی عمر سے ہی کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے
نیشنل ہسپتال کراچی میں نرسنگ کی تربیت حاصل کی اور وہاں
۶ سال تک کام کیا۔

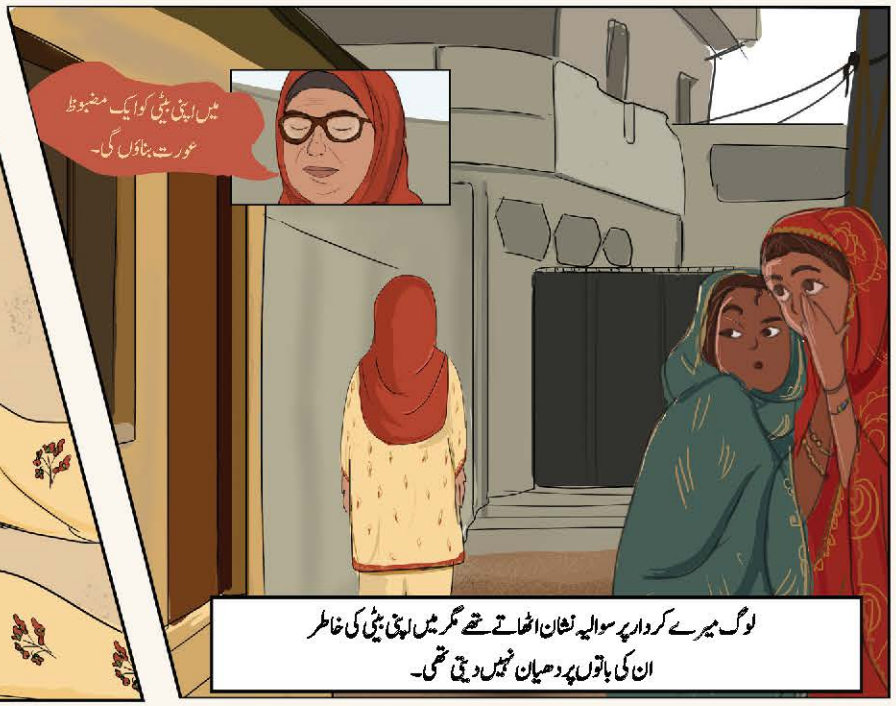
میں اپنی بیٹی کو ایک مضبوط
عورت بناؤں گی۔
لوگ میرے کردار پر سوالیہ نشان اٹھاتے تھے مگر میں اپنی بیٹی کی خاطر
ان کی باتوں پر دھیان نہیں دیتی تھی۔

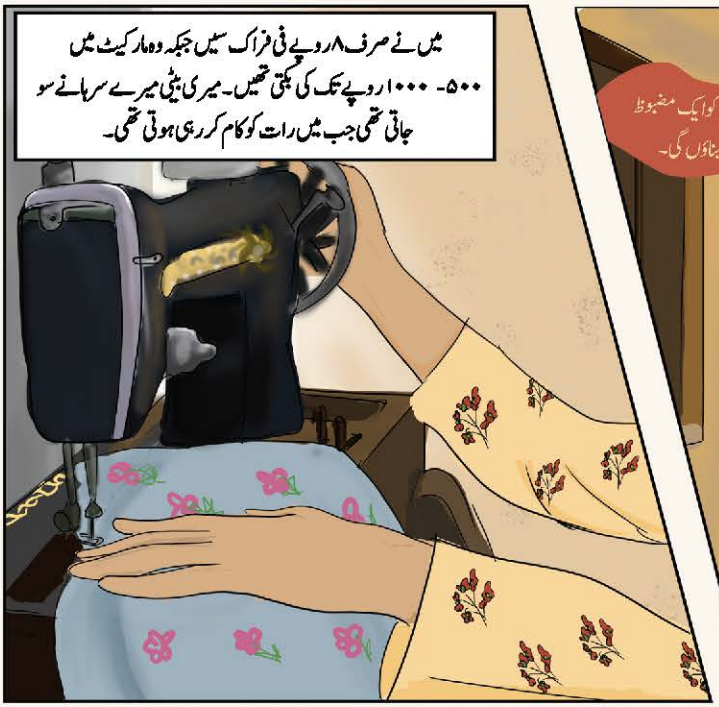
میں نے صرف ۸ روپے فی فراک سیں جبکہ وہ مارکیٹ میں
۵۰۰- ۱۰۰۰ روپے تک کی بکتی تھیں۔ میری بیٹی میرے سرہانے سو
جاتی تھی جب میں رات کو کام کر رہی ہوتی تھی۔

بے ایمان ٹھیکیدار سلائی کیے ہوئے فراک سے پیسے کاٹ لیتے تھے لیکن میں حساب کر سکتی تھی مجھے پتا تھا کہ ہمیں کتنے ملنے چاہییں۔



میں نے PILER کے ۱۵ دن کے تربیتی پروگرام میں حصہ لیا جو کہ خواتین مزدوروں کے لیا تھا۔ میں نے اپنے گرو کرامت علی صاحب سے بہت کچھ سیکھا اور فیصلہ کیا کہ میں خواتین کے حقوق اور انسانوں کے حقوق کے لیے کام کروں گی۔



ہمارے علاقے میں گھر سے کام کرنے والی خواتین کو کم اجرت ملتی تھی، میں نے خواتین سے کہا کہ وہ کام کرنے سے انکار کر دیں اگر ان کے مطالبات نہیں مانے جاتے۔ میں نے خواتین کے حقوق کے لیے لیبر یونین میں بھی کام شروع کر دیا۔



علی انٹرپرائزز میں آگ کے حادثے کے بعد ہم نے متاثرہ خاندانوں کے لیے ۱۸ لاکھ روپے حاصل کیے۔ نعیم انٹرپرائزز میں خواتین کو ۶۵۰۰ روپے تنخواہ ملنے لگی۔ تقریباً کم از کم اجرت ملی جو ہمارے لیے جیت تھی۔



۱۹۹۶ میں میں نے ہوزری گارمنٹ ٹیکسٹائل ورکرز جنرل یونین سندھ میں کام شروع کر دیا اور اس کی جنرل سیکٹری منتخب ہو گئی۔



یوتھ پارلیمینٹ بنکاک

میرے بیٹی ثناء، باب میری سب سے اہم
کامیابی ہے

میں نے لڑکیوں کے لیے پیشہ ورانہ ہنر مندی کا ادارہ شروع کیا۔ میں نے ان میں شعور بیدار کیا اور
انھیں تربیت دی کہ اگر ان کو ہراساں کیا جائے تو وہ بولیں اور مقابلہ کریں۔

بولو۔ بات کرو! اپنے لیے لڑو

آرام میرے لیے نہیں۔ دوسروں کی مدد کرنے سے مجھے سکون ملتا ہے۔

صباء علی بیگ

صباء کا پنجاب کے ایک دیہی علاقے میں کسان خاندان سے تعلق تھا۔ ان کا بچپن گھریلو تشدد، گھر پر حاکمانہ پابندیوں کے عائد ہونے اور چہارم جماعت کے بعد پڑھائی کو زبردستی بند کر دیا جانے کی وجہ سے خراب گزرا تھا۔ انہوں نے کچھ سالوں میں ایک مدرسے سے قرآن پاک حفظ کر لیا تھا لیکن گھر کے خراب ماحول سے بچ کر چھپ چھپ کر کھیتوں میں جا کر کہانیوں اور ناولوں کے پڑھنے کا شوق پیدا کر لیا تھا۔ اپنے چچا سے متاثر ہو کر جو پنجاب یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور اکثر مزدوروں کے حقوق اور یونین کی باتیں کرتے تھے صباء کو مزدوروں کی جدوجہد کی آگہی چھوٹے ہوتے ہی ہو گئی تھی۔

صرف ۱۴ سال کی عمر میں ہی ان کی پھوپھی حیلے بہانوں سے انہیں کراچی لے گئی تھی اور وہاں انہیں جبراً فیکٹری کے کام میں لگا دیا۔ استحصالی ٹھیکیداری نظام میں انہیں سختیاں برداشت کرنا پڑیں، تنخواہیں نا ملنا اور اپنی پھوپھی کے کہنے پر تنخواہوں کے اضافے کے لیے ہڑتالوں میں زبردستی حصہ لینا نے ان کی یکجہتی اور استحصال دونوں کے بارے میں آنکھیں کھول دیں تھیں اور ان کی جدوجہد کی بنیاد رکھ دی تھی۔

اپنی مرضی کے خلاف ۱۸ سال کی عمر میں ان کی شادی کرا دی گئی۔ صباء نے کئی سال گھریلو تشدد، پابندیاں، اور مالی انحصار کو برداشت کیا۔ طلاق کے بعد انہیں اپنے تین بچوں کو اکیلے ہی سنبھالنا پڑا۔ ان کو سب سے بڑا صدمہ اس وقت ہوا جب ان کی سب سے کم عمر بچی جل گئی اور گاؤں میں علاج کی صحیح سہولیات نا مکمل ہونے کی وجہ سے فوت ہو گئی۔ یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس نے انہیں کام اور عزت کی روٹی کے لیے لاہور شہر منتقل ہونے پر مجبور کر دیا۔

کپڑوں کی فیکٹریوں میں انھیں ہراساں ہونے، حد سے زیادہ کام اور مطلقہ ہونے کی وجہ سے بدنامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنی عزت پر سودا نہ کرنے اور دھمکیوں کے آگے نہ جھکنے کی وجہ سے انھیں کام کی زیادتی کو برداشت کرنا پڑا۔ "میں نے اپنے دل سے سب خوف نکال دیے،" وہ یاد کرتے ہوئے بتاتی ہیں، انھوں نے خاموشی کے بجائے استقامت کو چنا۔

استحصال کے خلاف مقابلہ کرنے کے پختہ ارادے سے صباء نے یونینز کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ انھوں نے لیبر ایجوکیشن فاؤنڈیشن (LEF) دریافت کی، وہاں ان کی راہنمائی اساتذہ جلوت شہزادی اور خالد محمود نے کی۔ ابتداء میں یونین بنانے کے لیے خواتین کو بغیر کوئی شور مچائے بتانا شروع کیا۔ انھوں نے آخر کار چند نوجوان مرد مزدوروں کا احترام جیت لیا جو ان کو اپنے برابر کا مزدور سمجھتے تھے۔ باوجود فیکٹریوں میں ایک بدکردار خاتون سمجھے جانے کے وہ چھت پر اجلاس منعقد کرتی رہیں اور چھپتے چھپاتے منظم کرنے کی جستجو میں لگی رہیں۔

دھمکیوں کا سامنا کرنا، حد سے زیادہ کام کرنا، اور آخر کار استعفوں کا ڈر جیسے مسائل کا سامنا کرتے ہوئے انھوں نے اپنی جدوجہد کو صوبوں تک پھیلا کر ایک ادارہ درج کروالیا۔ آج وہ پنجاب ٹیکسٹائل اینڈ پاور لوم اینڈ گارمنٹس کی یونین کی جنرل سیکٹری ہیں، وہ ممبر شپ کو بڑھانے کی کوشش میں پیش پیش ہیں خاص طور پر خواتین کی ممبر شپ کو بڑھانے اور جعلی یونینز کی اجارہ داری کی مخالفت میں جو اجتماعی سودے بازی کو کمزور کرتی ہے۔

اب انھوں نے اپنے ۳۰ سال کے ابتدائی اوائل میں دوسری شادی ایک ہم خیال ساتھی سے کی ہے جن سے وہ اپنی جدوجہد کے دوران ملی تھیں۔ صباء خاندانی زندگی اور قیادت میں توازن رکھتی ہیں۔ LEF کی مدد سے وہ منتظم کے طور پر مزدوروں کے مقدمات کے کاغذات تیار کرتی ہیں اور ان کا قانونی چارہ گوئی سے سدباب کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنی تعلیم دوبارہ شروع کر دی ہے تاکہ جہالت کے دھبے کو مٹا سکیں۔

ان کا نظریہ خواتین کو متحرک کر کے اور مزدوروں کے ساتھ مل کر جعلی یونینز "پاکٹ یونینز" کو مٹا کر ایک مضبوط یونین بنانا ہے جو در حقیقت ایک اجتماعی اصلی تنظیم ہو۔ وہ ہراسانی کے خلاف فیکٹریوں میں موثر کمیٹیاں بنانا چاہتی ہیں اور مزدوروں کو ان کے حقوق کے بارے میں آگہی دینا چاہتی ہیں بشمول اوور ٹائم کا مناسب معاوضہ اور شکایات درج کرانے کے طریقہ کار سے آگہی۔

مفسر: پرویز خان

صباء علی بیگ

جاری و ساری جدوجہد

بچپن میں مزدوری کرنے سے یونین رہنما ہونے تک
ایک خاتون کی عزت و قار اور اپنی پہچان کی جنگ



میرے والد کے گھر میں بے ہیمانہ رویے نے میرا اسکول
چہارم جماعت سے آگے رکوادیا۔

میرے تایا نے مجھے مزدوروں
کے حقوق اور لیبر یونینز کے
بارے میں آگہی دی۔



چودہ سال کی عمر میں میری پھوپھی
نے کراچی میں صائمہ اینٹرپرائزز
میں مجھے زبردستی فیکٹری کے کام
میں لگادیا (میرے والد سے
جھوٹ بول کر)۔



اپنی پھوپھی کے کہنے پر میں احتجاجوں میں شامل ہونے لگی جو معاوضے کی شرائط کے ناپید ہونے کے خلاف تھیں اس کے بعد میں نے یہ نوکری چھوڑ کر پرائم فیکٹری لمیٹڈ میں ملازمت کرلی، وہ بھی میں نے کم M & J تنخواہ کی وجہ سے چھوڑ دی۔ پھر میں نے کی کپڑوں کی کمپنی میں ملازمت اختیار کی جس میں کام کرنے کے حالات بہتر تھے۔



فیکٹری میری تمام تر دنیا بن گئی۔
جہاں کام کے اوقات بہت زیادہ تھے
معاوضہ بہت کم یا نہیں تھا اور مستقل
استحصال ہوتا تھا۔



میری شادی ۱۸ سال کی عمر میں ۳۷ سالہ شخص سے کردی گئی۔ ہماری ۲ بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔


مجھ پر سماج کا دباؤ تھا کہ میں گھر پر ہی رہوں اور کسی احتجاج میں حصہ نہ لوں۔
میری سب سے چھوٹی بیٹی میری طلاق کے سات سال بعد فوت ہو گئی۔
مزدور
متحد ہوں!
میں ہمیشہ سے چاہتی تھی کہ مزدور یونین بناؤں، جب میں لاہور کی کمبائینڈ فیکٹری لمیٹڈ میں کام کر رہی تھی تو میں نے کوشش کی کہ انھیں اکٹھا کروں۔
مزدوروں کے حقوق!
مزدوروں کے حقوق!
میں لاہور میں ٹیکسٹائل اور پاور لوم گارمنٹ ورکرز یونین کی جنرل سیکٹری بن گئی۔



بحیثیت عورت اور ایک یونین رہنما ہونے کے ناطے میں چاہتی ہوں
کہ زیادہ سے زیادہ خواتین اپنے حقوق کے لیے متحرک ہو جائیں!

زہرہ خان

کراچی میں پیدا ہونے والی زہرہ خان ایسے خاندان میں پیدا ہوئیں جو اعلی تعلیم حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا تھا جبکہ معاشرہ اس کی حوصلہ شکنی کرتا تھا۔ کلوتنگ اینڈ ٹیکسٹائل اور جنسیات کا مطالعہ (Gender Studies) میں ڈگریاں لیں اور معاشرے کی امیدوں کے برعکس فیصلہ کیا کہ وہ شادی نہیں کریں گی اور اپنی زندگی کو خواتین مزدوروں کو منظم کرنے میں وقف کر دیں گیں۔

ان کی گھروں سے کام کرنے والی عورتوں پر تعلیمی تحقیق نے ان کی آنکھیں کھول دیں اور انھیں سمجھ آیا کہ پاکستان کی معیشت میں خواتین کا اہم کردار ہے مگر وہ نظر نہیں آتا۔ ایسی خواتین جن کو دستکاری میں مہارت حاصل ہے مگر ان کو مزدور تسلیم نہیں کیا جاتا اور مزدوروں کے حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے انھیں غیر مناسب اجرتیں دی جاتی ہیں، ان خواتین کو دیکھتے ہوئے زہرہ میں ٹریڈ یونین میں شمولیت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اپنے ساتھی ناصر منصور سے استاد کی حیثیت سے مدد لیتے ہوئے اس رائے کی مخالفت کی کہ گھریلو خواتین کی صرف انجمن بنائی جائے بلکہ گھریلو خواتین کے لیے پاکستان کے آئین کے مطابق ٹریڈ یونین بنانے کے حق پر اصرار کیا۔

۲۰۰۹ میں زہرہ نے ہزاروں گھریلو خواتین کو تعلیمی حلقوں، یکجہتی کی مہمات اور عوامی جلوسوں کے ذریعے متحرک کرتے ہوئے کراچی اور حیدر آباد میں پہلی یونین رجسٹر کرائی۔ ان کی قیادت سندھ کے گھر سے کام کرنے والے مزدوروں کے قانون (۲۰۱۸) بنانے میں اہم وسیلہ بنی جو جنوبی ایشیا میں ایک مثال ہے، جس کی وجہ سے گھر سے کام کرنے والے مزدور باقائدہ مزدور تسلیم ہوئے جس سے ان کو تنخواہوں کے حقوق سماجی تحفظ اور نمائندگی حاصل ہوئی۔

ان کی تحریک کی طاقت ابھی بھی عام عوام ہیں۔ تعلیمی حلقے مزدوروں کے قوانین کی آگہی کو پھیلاتے ہیں اور خواتین کے درمیان یکجہتی کو فرقہ واریت، انسانیت اور طبقاتی تفرقات سے بالاتر ہو کر مضبوط رکھتے ہیں۔ زہرہ عام خواتین کی طاقت کی تعریف کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ایک دفعہ جب وہ اٹھ کھڑی ہوتی ہیں تو پھر وہ جلوس سے، نعروں سے اور اپنا حق مانگنے سے نہیں ڈرتیں چاہے وہ برقوں میں ہی کیوں نہ ہوں۔

"اگر آپ جگہ مانگیں گے تو لوگ دیں گے۔ ڈر ہماری سب سے بڑی رکاوٹ ہے-ایک دفعہ اسے توڑ دیا تو خواتین یونینز کو یکسر بدل سکتی ہیں۔"

زہرہ کی کامیابیوں میں حیدر آباد میں چوڑیاں بنانے والوں کے لیے تنخواہوں میں اضافہ حاصل کرنا بھی شامل ہے۔ سوشل سیکیورٹی میں اصلاحات کے لیے زور لگانا جس سے مزدوروں کا اندراج خود بخود ہو جائے اور افسران کی لاپرواہی جو قانون لاگو کرنے میں سست روی کا باعث بنتی ہے سے ٹکر لینا ہے۔ وہ اس وقت سندھ ایمپلائیز سوشل سیکیورٹی انسٹیچیوٹ (SESSI) بورڈ میں شامل ہیں جہاں وہ کارکن دوستانہ پالیسیوں کے حق میں وکالت کرتی ہیں۔

ان کا نظریہ واضح ہے: خواتین کے کام کو تسلیم ہونا چاہیے، اس کو تحفظ اور وقار ملنا چاہیے-نا کہ ان کے ساتھ خیراتی یا غیر رسمی مزدور کی حیثیت سے برتاؤ کیا جائے۔ زہرہ کے لیے گھر سے کام کرنے والی خواتین کو منظم کرنا صرف معاشی انصاف کے لیے نہیں بلکہ پاکستان لیبر موومنٹ کے مستقبل کو نئی شکل دینا ہے۔

مفسر: حادیہ مختار

جدوجہد کو مزدوروں کے گھروں تک لانے میں پر عزم

زہرہ خان




(صنفی علوم کی تعلیم)
میری گریجوایشن کی ڈگری پر کوئی بھی شعبہ مجھے داخلہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میرے والد نے مجھ سے کہا، "کیا تم سمجھتی ہو تم نے کافی پڑھ لیا ہے؟" اس سوال نے مجھے ترغیب دی اور میں نے کراچی یونیورسٹی میں جینڈر سٹڈیز میں داخلہ لے لیا۔
میرے دونوں والدین بہت حوصلہ افزائی کرنے والے تھے اور ہمارے گھر کا ماحول بہت سخت اور دقیانوسی نہیں تھا۔ مثال کے طور پر میں نے ایک جلوس میں حصہ لیا اور میری تصویر اخبار میں چھپی۔ میرے والد نے اسے فریم کرایا کیونکہ انھیں مجھ پر فخر تھا۔
ٹریڈ یونین تحریک
میرے استاد نے جو ٹریڈ یونین تحریک کے ساتھ منسلک تھے مجھے مشورہ دیا کہ میں ٹریڈ یونین کا راستہ اختیار کروں۔ اس حکمت عملی سے کہ گھر سے کام کرنے والی مزدور خواتین کے حقوق حاصل کیے جا سکیں۔
میرا ایم اے کے دوران تحقیقی کام گھر سے کام کرنے والے مزدوروں پر تھا۔ جس کی بدولت میں کئی خواتین مزدوروں سے ملی اور یہ بات جانی کہ ان میں مہارت ہے۔ لیکن اقتصادی بدحالی انھیں جائز اجرت حاصل کرنے سے روکتی ہے۔

HBW's — LABOUR

یہ صرف جنس کی بنیاد پر بنا مسئلہ نہیں ہے



میں نے مشکل حالات کا مقابلہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسئلوں پر بات کر کے اور ان کی تجاویز کو سن کر کیا۔ یکجہتی بہت ضروری ہوتی ہے۔ ہمارے تعلیمی حلقوں نے خواتین کو جوڑنے میں بہت مدد کی۔ ہمارے درمیان شعیہ، سنی، ہندو یا لاثانی بنیادوں میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ ہم سب مزدور ہیں۔

کچھ NGO نے HBWs کو صنفی مسئلہ سمجھتے ہوئے اسے لیبر ڈیپارٹمنٹ کے بجائے ویمنز ڈیپارٹمنٹ میں اٹھایا جس سے یہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ہم نے اس کو دوبارہ اٹھایا اور طبقاتی مسئلے میں تبدیل کر کے HBW کے قوانین میں لے آئے تاکہ یہ تمام مرد، عورتوں اور خواجہ سراؤں کو شامل حال کرے۔

2009
یونین رجسٹر ہوئی

2014
گھروں سے کام کرنے والی خواتین مزدوروں کی قرارداد منظور ہو گئی

2015
گھروں سے کام کرنے والی خواتین مزدوروں کی قرارداد منظور ہو گئی

2018
گھر سے کام کرنے والی خواتین مزدوروں کا قانون سندھ میں نافذ ہو گیا

ہم نے ۲۰۰۹ میں اپنی یونین بنالی جس میں کراچی اور حیدر آباد سے ۱۰۰۰ خواتین اکٹھی ہو گئیں۔
ہمارے شروع میں تین سے چار مقاصد تھے۔ پہلا یہ ہم چاہتے تھے کہ گھر سے کام کرنے والی خواتین مزدوروں کی اقتصادی اہمیت کو تسلیم کیا جائے۔

۲۰۱۳، ۲۰۱۴ اور ۲۰۱۵ میں گھر سے کام کرنے والی مزدور خواتین کے قوانین کی قراردادیں منظور ہوئی تھیں۔ ہماری وکالت کی وجہ سے بالآخر ایک پالیسی بن گئی اور ۲۰۱۸ میں ایک قانون کا اعلان ہو گیا۔ ہم نے سندھ میں سب سے پہلی گھر سے کام کرنے والے مزدوروں کی ٹریڈ یونین بنالی۔

۲۰۰۹ میں ہماری ایک کانفرنس ہوئی جس میں ۴۰۰ خواتین مزدوروں کو حصہ لینے کے لیے مدعو کیا گیا لیکن اس سے کہیں زیادہ آ گئیں اور انھوں نے اپنی کہانیاں بیان کیں۔ لیبر ڈیپارٹمنٹ ڈائریکٹر نے انھیں سنا اور وعدہ کیا کہ وہ ان کی مدد کرے گا جس کی وجہ سے ہماری پہلی یونین حیدر آباد میں تشکیل دی گئی۔

۲۰۱۵ میں ہم نے معاوضے پر نظرثانی کے لیے کہا؛ حکومت سندھ معاوضہ بڑھانے اور چوڑیاں بنانے والوں کو مزدور ماننے پر راضی ہو گئی۔ معاوضے میں اضافے کا اطلاق تمام مزدوروں پر ہوا تھا۔



چوڑیاں بنانے والوں کی کامیابی نے ہمیں حوصلہ دیا کہ ہم ایک اور اہم شعبہ کی طرف بڑھیں، یعنی ٹیکسٹائل اور گارمنٹس۔



ٹیکسٹائل اور گارمنٹس کی کم از کم اجرت کی وکالت جاری و ساری ہے۔



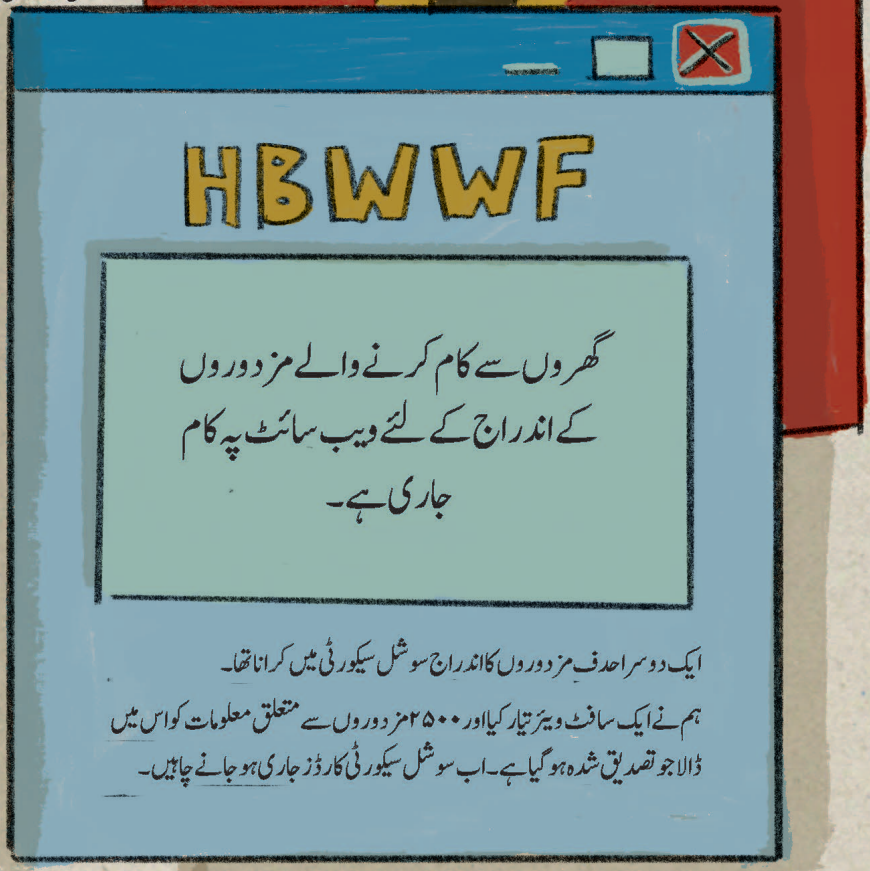

ایک دوسرا ہدف مزدوروں کا اندراج سوشل سیکورٹی میں کرانا تھا۔

ہم نے ایک سافٹ ویئر تیار کیا اور ۲۵۰۰ مزدوروں سے متعلق معلومات کو اس میں ڈالا جو تصدیق شدہ ہو گیا ہے۔ اب سوشل سیکورٹی کارڈز جاری ہو جانے چاہیں۔

اب ہم فارماسوٹیکل (دوائیوں کی فیکٹری) کے شعبے میں مزدوروں کے استحصال کے معاملے میں ان کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ ہم چارٹر آف ڈیمانڈز (مزدوروں کے مطالبات کا منشور) جس میں زچگی کی چھٹیوں، مزدوروں کی تربیت اور خواتین کی ٹریڈ یونین میں نمائندگی پر کام کر رہے ہیں۔

ہم ٹریڈ یونینز میں مردوں سے بھی بات کر رہے ہیں کہ وہ اس کو بااثر بنائیں۔





مصنف

صباء گل خٹک نے پولیٹیکل سائنس میں پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے اور انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹرز کیا ہوا ہے۔ ایک آزاد محقق ہونے کے ساتھ ساتھ انھوں نے پلاننگ کمیشن آف پاکستان اور ورلڈ بینک میں ایک سینئر افسر کے طور پر بھی کام کیا اور سسٹینبل ڈیویلپمنٹ پالیسی انسٹیٹیوٹ (SDPI) اسلام آباد میں ایگزیکٹیو ڈائریکٹر کے عہدے پر معمور رہیں۔ وہ نظم وضبط، بالترتیب اور براہ راست تشدد، حقوق نسواں کی حمایت سے متعلق، اور اقتصادی اور سماجی حکمت عملیوں کی ہم آہنگی کو یکجا رکھتے ہوئے لکھتی ہیں۔

مفسران کے بارے میں

عبداللہ شاہد

عبداللہ شاہد ایک پاکستانی مفسر اور تصویر کش قصہ گو ہیں جن کا کام خاکے، احساس اور جیتے جاگتے تجربے کی آمیزش کرتا ہے۔ ۲۰۲۵ میں ویزیول کمیونیکیشن ڈیزائن میں بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد عبداللہ نے مشاہدے، شناخت اور انسانوں کے چھوٹے چھوٹے اکثر نا نظر آنے والے واقعات کو اپنے کام میں پیش کیا۔

ایمن سلیم

ایمن سلیم ایک ویزیول کمیونیکیشن ڈیزائنر ہیں۔ وہ تصویروں سے عکاسی کرنے کا شوق رکھتی ہیں اور تجارتی نشانوں کو بھی اس طرح پیش کرنے میں دلچسپی رکھتی ہیں کہ وہ دوسروں سے منفرد نظر آئیں۔

اریبہ شوکت قریشی

اریبہ شوکت قریشی بین الضابطہ شعبوں سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا کام دوسروں کی بھلائی، رسائی اور روزمرہ کی مزاحمت کی سیاست میں سمت کا تعین کرنا ہے۔ تنقیدی تصویر کشی کے ذریعے وہ موجودہ نظام پر سوال اٹھاتی ہیں اور متبادل منصفانہ جینے کے راستے تلاش کرتی ہیں۔

عزقہ عظیم

عزقہ عظیم ایک ویزیول کمیونیکیشن ڈیزائنر اور مفسر ہیں۔ انھوں نے گرافک ناولز (تصویروں کی مدد سے کہانیاں)، ویب کامکس (انٹرنیٹ پر خاکے)، اور تصویروں کی بنیاد پر بیان کردہ منصوبوں پر کام کیا ہے۔ وہ اداسی، ماضی کی گہری یادیں، صدمہ، اور خواہشات کو تلاش کرنے میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ وہ تصور کی مدد سے کہانیوں میں گہرے جذبات کو تصویروں میں ڈھال کر عکاسی کرتی ہیں۔

بلال احمد

بلال احمد ڈیزائن، افسانہ اور تحت الشعور کو ایک نقطے پر مرکوز کر کے کام کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر ٹکڑا دنیا کا دروازہ کھولتا ہے جہاں وقت بدل جاتا ہے اور نیا چہرہ سامنے آتا ہے۔

ایمان ٹوانہ

ایمان ٹوانہ ایک مفسر اور سرامک آرٹسٹ (مٹی سے چیزیں بنانے کا فن) ہیں جن کا کام کہانیوں کے گرد گھومتا ہے۔ وہ تصویریں بنا کر روزمرہ کے لمحات، ثقافت، اور ذاتی قصوں کو تلاش کرتی ہیں۔ اپنی ویزیول کمیونیکیشن ڈیزائن (تصویروں سے خیالات کا تبادلہ کرنا) کے تجربے اور دستکاری کے شوق کے امتزاج سے وہ تصویروں اور مٹی کے فن پاروں کو بغیر کسی جھول کے آسانی سے ملاتی ہیں۔ اپنے فن سے ایمن کہانیوں میں اپنے تصوراتی اظہار، پرکشش اور پرجوش انداز سے جان ڈال دیتی ہیں۔

ہادیہ مختار

ہادیہ مختار ایک مفسر اور گرافک ڈیزائنر ہیں۔ آج کل وہ ویزیول کمیونیکیشن ڈیزائن میں ایم اے کی ڈگری حاصل کر رہی ہیں۔

محمد حایان

محمد حایان ایک مفسر/اینیمیٹر (تصویروں کو متحرک کرنے کا کام) ہیں۔ وہ خیالی ویڈیو گیمز کے ساتھ منسلک ہیں اور معاشرے سے متعلق خیالات کو انسانوں کے رویوں یا سماجی میل جول کو فلسفانہ انداز سے اپنے فن کے ذریعے پیش کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔

پرویز خان:

پرویز خان کراچی سے تعلق رکھنے والے ایک ویزیول کمیونیکیشن ڈیزائنر اور مفسر ہیں۔ وہ ثقافتی بنیادوں مفسر، اداریوں کو تصویروں میں ڈھالنا اور قصے کہانیوں سے متاثر ڈیزائن کے کاموں کے ماہر ہیں۔ ان کا کام سماجی موضوعات، انفرادی حیثیت، اور معاشرے کے تجربات پر مبنی کہانیوں کو بیان کر کے اپنی تخلیقی صلاحیت سے نمایاں کرنا ہے۔ پرویز نے مختلف اداروں کے ساتھ مل کر جریدوں، برانڈ سازی، اور تعلیمی منصوبوں پر کام کیا ہے۔ وہ ڈیزائن کو آگہی اور بامقصد اثر ڈالنے والا آلہ سمجھتے ہوئے اس میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔

راحیل حسین ٹوانہ

راحیل حسین ٹوانہ کئی شعبوں کے ڈیزائنر، مفسر، اور فن کے ناظم ہیں جن کا تعلق پاکستان کے شہر راولپنڈی سے ہے۔ ان کے فنکارانہ مشغلے ماضی کی یادوں، پروان چڑھنے کی عمر اور زندگی کے تجربات سے متاثر ہو کر سماجی اور معاشرتی پیچیدگیوں کو تلاش کرنے میں پنہاں ہے۔ ان کا کام صنفی شناخت، سماجی سیاسی سرگرمیوں اور ذاتی کہانیوں سنا کر متحرک ذہنی تصورات کی مدد سے اخذ کر کے ڈیجیٹل آرٹ، چھپائی اور گرافک ڈیزائن میں ڈھالنا ہے۔

شازہ عمر

شازہ عمر ایک تصویروں میں جان ڈالنے والی اور مزاحیہ تصاویر کی مفسر ہیں جو لوک کہانیوں، سماجی محفوظات اور افسانوں کی حاشیہ آرائی سے کرداروں کو تشکیل دیتی ہیں۔ ان کی مزاحیہ تصاویر صحافت میں تجسس کے تسلسل کا حصہ ہیں۔

Scan to view all the detailed interviews



پاکستان کی ٹریڈ یونین میں خواتین لیڈرز

جدوجہد اور لیڈرشپ

ٹریڈ یونینز معاشرے کی جمہوریت کا چہرہ ہیں جو مزدوروں کے حقوق کا دفاع کرتی ہیں اور ان میں قیادت ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ٹریڈ یونینز میں خواتین دنیا بھر میں مردانہ غلبے کا سامنا کرتی ہیں۔ اس لیے جب وہ قیادت کرنے کی جسارت کرتی ہیں تو یہ خود ایک بہت بڑا دنیا کے لیے پیغام ہوتا ہے۔ خواتین کی ٹریڈ یونینز میں قیادت صرف نوجوان خواتین کے لیے راستے نہیں کھولتی بلکہ یہی برسوں سے بنے مردانہ ذہنی طرز عمل کو بھی للکارتی ہے۔

یہ اشاعت پاکستان کی ٹریڈ یونینز میں ان باہمت خواتین کی قیادت کی گیارہ کہانیوں کو بیان کرتی ہے جنہوں نے مزدوروں کے حقوق کے لیے جدوجہد کی جو کہ قارین کو بلاشبہ متاثر کرے گی۔

اس موضوع سے متعلق مزید معلومات یہاں سے مل سکتی ہیں :

pakistan.fes.de/publications ↖

Friedrich Ebert Stiftung